فہرستِ مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۱

ماہ جولائی ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۱

ماہ جولائی ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۱ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۷ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہمارے وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی کو اس وقت بڑی مقبولیت حاصل ہے، وہ نہ صرف اپنی سیاسی جماعت کے قابل قدر رہنما ہیں، بلکہ عام لوگوں میں بھی مقبول ہیں جن کے دلوں کی تسخیر کے لئے بار بار کہہ رہے ہیں کہ اس ملک کی جمہوریت کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کا ہر شہری نڈر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہے،

اس سے اردو بولنے والوں کو بھی نڈر ہو کر کچھ بولنے کا موقع مل گیا ہے، ہمارے دستور میں ہر زبان کو ترقی کرنے کا آئینی حق دیا گیا ہے مگر ۴۷ء کے بعد سے اس ملک خصوصاً یوپی، اور بہار میں بادشاہوں کو تاج و افسر اور حسینوں کو زیور پہنانے والی اردو ایک مظلوم مقہور اور مفلوج زبان کی حیثیت سے دن کاٹ رہی ہے، اسکی ساری شاندار اور باوقار تاریخ نظر انداز کر دی گئی ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ ہندو مسلم کے میل ملاپ کے ایک مخصوص ماحول کی پیداوار نہیں ہے، اور اس کا اصلی وطن برج کا سبزہ زار نہیں ہے، اس نے عربی، فارسی، پراکرت، ہندی اور انگریزی ادب کا رس نچوڑ کر اسلوب بیان کو ایک نیا رنگ و روپ اور نیا ڈھنگ دیا ہے، اس کے لئے لطافت حلاوت آنکھیں بچھاتی ہیں، اس کے قدموں میں برجستگی اور بے تکلفی لوٹتی ہیں، اس کو خود یہاں کی نئی جلی تہذیب نے سنوارا ہے تو اس نے بھی یہاں کی تہذیب کو نکھار کر اس میں بانکپن پیدا کیا ہے، یہ عالمگیر تہذیب و تمدن کی دولت سے بھی مالامال ہے، مختلف مذاہب کے لوگوں نے بڑھ کر اس کے گلے میں مرصع ہار بھی پہنایا ہے،

اس کی آواز واشنگٹن، ماسکو، تاشقند، لندن، بغداد، ٹوکیو اور انقرہ وغیرہ کی ریڈیائی لہروں میں بھی سنائی دیتی ہے، یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے شعبے بھی کھولے گئے ہیں، خود ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس کے مصنفوں اور شاعروں کو گراں قدر انعامات دے کر نوازتی بھی رہتی ہیں، پڑوسی ملک پاکستان سے جب جب لڑائیاں ہوئیں تو اسی کا سہارا لیکر وہاں کے لوگوں سے اعصابی جنگ بھی کی گئی، آزادی سے پہلے تو یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتی تھی، ع :- جہاں جائیے گا، ہمیں پائیے گا،

اس کی تاریخی، تہذیبی، لسانی اور افادی اہمیت کے باوجود اب اس کو نہ صرف آئینی مراعات بلکہ زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے، گذشتہ تیس برس تک ہماری حکومت نے اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں بڑی مہارت دکھائی، ع :- تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا،

اسی بے قراری کے دور میں ملک کی جنتا گذشتہ حکومت کی زیادتیوں کے خلاف کھڑی ہوئی تو اردو بولنے والے بھی اس کے ہراول، چپاول، یمین و یسار میں پیش پیش رہے، جب جنتا کے بقول یہ جابر حکومت ختم ہوئی تو اردو بولنے والے بھی اس کے ساتھ شادیانے بجانے میں مشغول تھے، ان کو توی امید تھی کہ اردو کو جو حق گذشتہ تیس ۳۰ سال کے اندر نہیں ملا تھا، وہ جنتا کی فراخدل روادار اور ہر دلعزیز حکومت میں ضرور مل جائیگا، مگر یکایک مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ اور پھر وزیر اعظم نے بھی اردو کے لئے ماتمی بگل بجا کر یہ اعلان کیا کہ اردو عوام کی اکثریت پر مسلط نہیں کی جا سکتی، اس کو سن کر اردو بولنے والے کلیجہ تھام کر رہ گئے کہ ع

اک اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا اور سو کھا ہی کیا

یوپی اور بہار میں یہ زبان علاقائی قرار نہیں دی گئی، تو اس کو زندہ رکھنے کی لئے کوئی زہر کام نہیں دیسکتا، کسی اقلیت سے اس کی مادری زبان چھیننے کے معنی اس کی نسل کشی ہے، جو ملک کے آئین کے سراسر خلاف ہے، مگر جب کوئی اقلیت سیاسی کھلونے اور جھنجھنے سے بہلائی جا سکتی ہے، اور وہ چھوٹے بڑے عہدے لے کر مطمئن ہو سکتی ہے، یا اس کا کوئی خوش باش، خوش پوش اور خوش گو سیاست داں تھوڑی سی رعایتیں پا کر اس کے سارے اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال سکتا ہے تو ایک طاقتور اکثریت کو پورا حق ہے کہ اقلیت کی نہ صرف لسانی بلکہ تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی وراثت کو رفتہ رفتہ ختم کر کے اس کے وجود کو غیر موثر بلکہ ناکارہ بنا دے،

آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے جب اس ملک میں زبان کا جھگڑا شروع ہوا تھا تو بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق نے اردو کے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں مگر

اردو بولنے والے بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں، مگر اب یہی اردو بولنے والے ہیٹے ہو چکے ہیں؛ وہ کسی جلسہ میں سینہ کوبی یا تفریحی مجلسوں میں گلہ مندی، یا اپنی کوتاہی کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنے ہی میں اپنے پورے فرض کی ادائگی سمجھتے ہیں، گورکھی بولنے والے بھی اقلیت میں ہیں مگر انھوں نے اپنے حق کی بھیک نہیں مانگی ہے، بلکہ اپنا حق حاصل کیا ہے، اُن کے اکالی دل پر فرقہ واریت کا الزام آتا رہا؛ مگر انھوں نے اسی تنظیم کے ذریعہ سے اس کا عملی ثبوت دیا، کہ زندگی کی بزم ے میں کوتاہ دستی ہی سے محرومی حاصل ہوتی رہتی ہے، مینا اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو بڑھ کر خود اس کو اٹھا لیتا ہے،

ہماری حکومت اس سے بے خبر نہیں کہ زبان کا معاملہ بہت ہی جذباتی ہوتا ہے، لسانی مسئلہ ہی پر مشرقی پاکستان منتقل ہو کر بنگلہ دیش بن گیا، آسامی اور بنگلہ دیش کے اختلاف پر کئی بار سخت خونریزی ہو چکی ہے، جنوبی ہند شمالی ہند کی لسانی سامراجیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ کی مختلف زبانیں یک جہتی کے نام پر کسی ایک رسم الخط کو بھی اپنانے کے لئے آمادہ نہیں، کیا ہماری حکومت کو اس کا احساس نہیں کہ اردو بولنے والوں میں بھی اُن کے جذبات کی پامالی پر ناخوشگوار ردِ عمل ہو سکتا ہے، یا وہ سمجھ چکی ہے کہ یہ غیرت و حمیت سے خالی ہو کر بے کفن کی ایک میت ہے جس کو اُن کے شاندار ماضی کے مقبرہ کے اندر دفن کرنے کی دیر ہے، ہماری موجودہ حکومت کے سامنے یہ تاریخی فیصلہ ہے کہ گذشتہ حکومت نے دل شکنی، دل آزاری، اور دل خراشی کر کے اپنے سارے شاندار اور زریں کارنامے پر پانی پھیر دیا، بدلے ہوئے حالات میں کیا دلجوئی، دل نوازی اور دل آرائی کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اردو نہیں بولتے ہیں، اور کیا اردو بولنے والے اس ملک میں یہ سمجھ کر اپنی زندگی گزاریں کہ ع

دل پُر داغ ہی اپنا چمن ہے

مقالات

اقبال اور عظمتِ آدم

از۔ جناب جگن ناتھ آزاد، سری نگر

اقبال نے جس طرح اپنی اردو اور فارسی شاعری میں عظمتِ انسان کے گیت گائے ہیں، اس کی مثال شاید کسی اور زبان کی شاعری میں نہ مل سکے، کلام اقبال میں کہیں تو عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے ہوئے نظر آتے ہیں، اور کہیں کہکشاں، ستارے، اور نیلگوں افلاک عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر دکھائی دیتے ہیں، کہیں مُشتِ خاک کے فرشتوں سے زیادہ تابناک ہونے کی بشارت ملتی ہے تو کہیں یہ خاکِ پُر اسرار ثریا سے بھی اونچی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے،

اس ضمن میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا اقبال کے یہاں عظمتِ آدم کا تصور محض خالی خولی ایک جذباتی تصور ہے، یا اس میں ایسے عوامل شریک ہیں جن کی بنیادیں شعوری اور سماجی حقیقتیں کام کر رہی ہیں۔

اس بحث کو شروع کرنے سے قبل یہ بیان کر دینا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ روئے زمین پر انسان کے ظہور کا مسئلہ اُن مشکل ترین مسائل میں سے ایک ہے، جن سے ذہنِ انسانی تخلیقِ کائنات سے لے کر آج تک دوچار ہوتا چلا آ رہا ہے، اکبر الہ آبادی نے اس دقیق مسئلے کو اپنے مزاح کا

موضوع بنایا، اور یہ کہہ کر بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی،

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست

حالانکہ منصور کے انا الحق کہنے سے اُس نظریۂ ارتقا کی تردید نہیں ہوتی جو ڈارون نے پیش کیا تھا۔ انا الحق پر اقبال کا یہ اعتراض تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ ہندو ویدانت کا[1] اثر تھا، لیکن یہ کہ انا الحق کہنے سے جدید نظریۂ ارتقا کی نفی ہوتی ہے، قرینِ قیاس نہیں، کشود اسرار کی اس کڑی منزل سے اقبال بھی گزرے ہیں، اور نظامِ کائنات میں انسان کا ایک اعلیٰ اور ارفع مقام متعین کرنے کے باوجود اُن کا ذوقِ تجسس اس قسم کے اشعار میں ظاہر ہوتا رہا ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جائے گا، آیا ہے کہاں سے

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
میں خود اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
اگر مقصودِ کُل ہوں میں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی ابتدا کیا ہے

دراصل اقبال کے نزدیک حقیقت کی بنیاد روحانیت ہے، اور اسی روحانیت پر

---

[1] کائنات کے متعلق جب یہ نقطۂ نظر قائم ہوا تو اس کا براہِ راست نتیجہ غیر شخصی جذب کے تصور کی صورت میں برآمد ہوا، سب سے پہلے یہ تصور حضرت بایزید بسطامیؒ میں رونما ہوا اور یہ اس مکتب کے مابعد کے مخصوص خط و خال میں سے ہے، اس تصور کے نشو و نما پر اُن ہندو زائرین کا اثر پڑا ہوگا جو ایران میں سے ہوتے ہوئے اُن بدھی مندروں کو جایا کرتے تھے، جو اس وقت باکو میں موجود تھے۔ اس مکتب کو حسین منصور نے بالکل وحدت الوجودی بنا دیا، اور ایک سچے ہندو ویدانتی کی طرح انا الحق (اہم برہم اسمی) چلا اُٹھا۔ (Development of Metaphysics in Persia by Iqbal)
(ترجمہ از۔ میر حسن الدین)

یہ سارا نظامِ عالم قائم ہے۔ زندگی کا یہ کارخانہ اقبال کی نظر میں محض ذراتی یا غیر ذی روح عناصر کے باہمی امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے، چنانچہ آغاز کائنات سے لے کر انسان کی ظہور پذیری تک کے منازل کو محض طبیعیاتی اور کیمیاوی اصطلاحات میں بیان کرنا اقبال کے نظامِ فکر کے ساتھ متصادم ہونے کے مترادف ہے، اس لیے اقبال کی شاعری میں اقبال کا نظریۂ انسان تلاش کرنے کے لیے اس تصور کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق اُس مادے سے ہوئی ہے، جس کا مقدر انجام کار ایک غیر متحرک اور جامد صورت اختیار کرنا ہے، بلکہ اس کے خلاف فلسفۂ اقبال کی رُو سے انسان علت العلل ماہیت کی بنیادی صداقت ہے، اقبال کا یہ نظریہ کلامِ اقبال میں جابجا نظر آتا ہے۔ "زبورِ عجم" میں کہتے ہیں ؎

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
این مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود
از شوخیِ آب و گِل در گفت و شنود آمد

مہ و ستارہ کہ در راہِ شوق ہم سفر اند
کرشمہ سنج و ادا فہم و صاحب نظر اند
چہ جلوہ ہاست کہ دیدند در کفِ خاکے
تغافلے بجانبِ افلاک سوی ما نگرند

اقبال کے نزدیک یہ ایک بنیادی روحانی صداقت ہے کہ انسان خدا ہی کی تخلیق ہے، لیکن خالق اور مخلوق کا رشتہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اقبال کی شاعری میں یہ ایک ایسا پہلو اختیار کرتا ہے، جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اور اس کی مثالیں کلامِ اقبال میں اوّل سے آخر تک موجود ہیں،

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

یا کشا این پردۂ اسرار را
یا بگیر این جانِ بے دیدار را
نخلِ فکرم ناامید از برگ و بر
یا تبر بفرست یا بادِ سحر

خدائی اہتمام خشک و تر ہے ... خداوندا خدائی دردِ سر ہے

و لیکن بندگی استغفر اللہ ... یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

لیکن اقبال نے خالق و مخلوق کے رشتے کی جو یہ تصویر بنائی مکمل تصویر نہیں بلکہ اس تصویر کے متعدد پہلوؤں میں سے محض ایک پہلو ہے، ایک اور پہلو جو اس تصویر میں شامل ہے، یہ ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی ... مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

اس تصویر کا ایک اور اہم پہلو "زبورِ عجم" کی اس غزل میں نظر آتا ہے،

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست ... چوں ما نیازمند و گرفتارِ آرزو ست

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش ... گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہو ست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما ... چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگو ست

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما ... بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سو ست

ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکیے ... نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بو ست

ان تمام پہلوؤں میں اقبال خدا اور انسان کے رشتے کی محض ایک جھلک پیش کرتے ہیں کہ خواہ بندگی اقبال کے لیے دردِ سر ہو یا مقامِ بندگی دے کر اقبال شانِ خداوندی لینے کو بھی تیار نہ ہوں، یا خدا انسان کی تلاش میں ہو ـــــ ایک نکتہ آئینے کی طرح روشن ہے، اور وہ ہے ذاتِ مطلق سے الگ انسان کا اپنا وجود، سمندر سے الگ ندی کا اپنا وجود۔ قطرہ الگ سمندر الگ۔ انائے مقید الگ انائے مطلق الگ،

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی

در دلِ خاک فرو رفت و بہ دریا نرسید

یہ بہ دریا نہ رسیدن ہی انسان کی خودی کا کمال ہے، جسے فلسفۂ اقبال میں ایک مرکزی خیال کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ تو خیر خالق و مخلوق کے باہمی رشتے کے مختلف پہلوؤں کی بات ہوئی، بنیادی بات اس تعلق سے فکرِ اقبال میں یہ ہے کہ خدا نے کائنات اور انسان کو اپنے وجود کے اظہار کے لیے پیدا کیا۔ ذاتِ خداوندی تخلیقی قوتوں سے لبریز ہے، اور ان تخلیقی قوتوں کے قدرتی بہاؤ کا ایک مظہر تخلیقِ آدم ہے۔ اس مخلوق کے اندر ذاتِ خداوندی کی غیر محدود تخلیقی قوتیں تو نہیں لیکن اس میں وہ صلاحتیں موجود ہیں، جو جادۂ تکمیل پر گامزن ہو کر انسان کے اندر خدائی صفات کے پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہیں، لیکن یہ سب رحمتِ خداوندی کا ایک ثمرہ ہے، اس کے سوا اس کی نہ کوئی اصل و حقیقت ہے نہ بنیاد۔

رحمتِ خداوندی کا یہ مظہر۔ انسان ـ گلشنِ کائنات کا گلِ سرسبد ہے، یہ شاخِ نہالِ سدرہ ہے۔ خار و خسِ چمن نہیں ہے۔ ذاتِ مطلق نے ربوبیت کی آب و تاب اور شانِ ربانی انسان ہی کے ذریعے سے نمایاں کی ہے، تخلیقِ کائنات کا سبب دراصل تخلیقِ آدم ہی ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک اس عظیم ارتقاپذیر نظام میں انسان کا ظہور کوئی اتفاقی امر نہیں ہے اور نہ ہی اس بے حد و بے پایاں کائناتی حقیقت میں انسان محض ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ

تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی ... نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اقبال کے نزدیک کائنات کی تخلیق محض اس مقصد کے پیشِ نظر ہوئی ہے کہ انسانی انا کے ظہور اور اس کی تکمیل کے لیے زمین تیار کی جائے۔ کائنات اگر ایک تمثیل ہے تو

انسان اس تمثیل کا عظیم ترین کردار۔ انسان ایک ایسی کتاب ہے جس میں کائنات کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ انسان کے بغیر کائنات بالکل ایسی ہی ہے، جیسے "ہیملٹ" پرنس آف ڈنمارک کے بغیر۔

انسان کے روئے زمین پر ظہور کی تصویر اقبال نے اپنے سحر کارانہ انداز میں یوں پیش کی ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہانِ مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

انائے مطلق کے ساتھ انائے مقید کا رشتہ اقبال نے اپنی شاعری اور اپنی نثر میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انائے مقید انائے مطلق کے اندر ایک جاودانی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اقبال نے انسان کو اکثر غیر فانی کہا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان انائے مطلق کی تخلیقی قوت کے اندر ایک امکان کے طور پر موجود ہے گویا انائے مقید انائے مطلق کی ایک مخلوق ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ، ایک ہستی رکھتی ہے؛

ز آغازِ خودی کس را خبر نیست
خودی در حلقۂ شام و سحر نیست

ز خضر این نکتۂ نادر شنیدم
کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

ضمیرش بحرِ ناپیدا کنارے
دلِ ہر قطرہ موجِ بے قرارے

حیاتِ آتش خودی ہا چوں شررہا
چو انجم ثابت و اندر سفر ہا

ربانی حقیقت کے اندر ایک امکان کے طور پر انا کی موجودگی غیر فانی ہے، لیکن اس امر کو فراموش بھی نہ کرنا چاہیے کہ اس انا کی نمود کا سبب محض حکم ربانی اور تخلیق ربانی ہے، اور سلسلۂ ارتقاء ہی اس کے حصول کا باعث بنتا ہے۔ گویا حقیقت مطلقہ میں ایک امکان کے طور پر اس کا قیام بے شک قدیم سہی لیکن کائنات میں اس کی نمود حادث ہے،

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تُو میں پیدا من و تُو سے پاک

ازل اُس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اُس کی موجوں کے سہتی ہوئی

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

اقبال آدم کے جنت سے زمین تک کے سفر کو ایک سفر ارتقاء کے روپ میں دیکھتے ہیں، یہ زوال آدم نہیں بلکہ عروج آدم ہے، زمین آدم کے لیے کوئی مصائب خانہ نہیں ہے جہاں آدم کو سزا بھگتنے کے لیے بھیج دیا گیا ہو۔ یہاں اقبال قرآن کے نظریۂ ہبوط آدم کو جذبۂ ارتقاء کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ "عہد نامۂ قدیم آدم کی حکم عدولی کے لیے زمین کو برا بھلا کہتا ہے، لیکن قرآن زمین کو انسان کے لیے مسکن و مامن سمجھتا ہے، اور انسان کے لیے ذریعۂ منفعت قرار دیتا ہے، جسے اپنے تصرف میں لانے کے لیے انسان کو اللہ تعالےٰ کا شکر گذار ہونا چاہیے،[۱] وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ٥[۲]

ص ۸۴ Reconstruction of Religious Thought in Islam

.... گویا ہبوطِ آدم کی روایت بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے، کہ انسان جنت سے نقلِ مکانی کر کے زمین پر آیا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان جبلی میلان کی ایک ابتدائی حالت سے چل کر آزاد انا کے باشعور تصرف کی منزل تک پہنچا جہاں اس کے اندر شک کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی، اور حکم عدولی کرنے کی صلاحیت بھی۔ یہ ہبوط کوئی اخلاقی معزولی نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے سادہ شعور سے خود آگاہی کے اولیں پرتو کی جانب سفر ہے"۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں،

"انسان کا حکم عدولی کا پہلا عمل اُس کا آزادانہ طور پر اپنے اختیار کو استعمال کرنے کا پہلا عمل بھی تھا، اور یہی سبب ہے کہ آدم کا پہلا ارتکابِ جرم معاف کر دیا گیا تھا"۔

اور یہیں سے اقبال کے تصورِ عظمتِ انسان کی ابتدا ہوئی ہے، اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں۔

"جنت میں جس کا ذکر اس روایت میں آیا ہے سب سے پہلا واقعہ جو رونما ہوا، انسان کا ارتکابِ جرم حکم عدولی تھا، جس کے فوراً بعد اسے جنت سے نکال دیا گیا، دراصل قرآن اس لفظ (جنت) کا مفہوم جس طرح سے اس روایت میں آیا ہے، خود بیان کرتا ہے۔ اس روایت کے دوسرے حصے میں باغ (جنت) کا جو بیان دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں نہ بھوک ہے نہ پیاس،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) اس آیت کا حوالہ صحیح نہیں دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے، یہ سورۃ الاعراف کی نویں آیت نہیں بلکہ دسویں آیت ہے۔ (آزاد) سے اور ہم ہی نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا، اور اس میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کئے (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔

نہ گرمی نہ عریانی۔ اس لیے اس ضمن میں میری سوچ اس مفہوم کی جانب مائل ہے کہ قرآنی روایت میں "جنت" ایک ابتدائی حالت کے تصور کا نام ہے، جس میں انسان عملی طور پر اپنے ماحول سے لاتعلق رہتا ہے، اور نتیجۃً اس انسانی طلب کے نیش کو محسوس نہیں کرتا جس کی نمو ہی دراصل انسانی تہذیب کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے"۔

طلب انسانی کے اس نیش سے انسان جنت میں نہیں بلکہ زمین پر آ کے آگاہ ہوتا ہے، گویا اُسے اپنی صلاحیتوں اور ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا احساس ...... زمین ہی پر آ کے ہوتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ انسان کو زمین پر نائب حق بنا کر بھیجا جاتا ہے، یہ منصب انسان کو جنت میں حاصل نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں زمین انسان کے لیے ہر اعتبار سے ایک ارفع تر مقام ہے،

بقولِ اقبال خیر یا نیکی کوئی جبر کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی نصب العین کے سامنے آزادانہ طور پر سپردگی کا نام ہے۔ اور آزاد انا جب آزاد انا کے ساتھ بغیر کسی جبر کے تعاون کرتا ہے تو خیر یا نیکی معرض وجود میں آتی ہے۔ ایک ایسا فرد جو آزادیِ فکر سے عاری ہے اور جس کی حرکات محض مشینی حرکات کی حیثیت رکھتی ہیں، اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے خیر یا نیکی ظہور پذیر ہو سکے"۔

اپنے اس خیال کو اقبال جاوید نامہ میں نہایت ماہرانہ انداز سے پیش کرتے ہیں جب تخلیق کائنات کے پہلے ہی دن آسمان زمین کو ملامت کرتا ہے۔ اُفق سے پہلی صبح طلوع ہوتی ہے، اور وہ عالم نوزادہ کو اپنے پہلو میں لے لیتی ہے، یہ زمین اسوقت تک محض ایک خاکدان ہے۔ اس کا دشت کسی کاروان سے آشنا نہیں ہے، نہ اس کے پہاڑوں میں کوئی نہر

ہنگامہ آرا ہے، نہ اس کے صحرا پر ابھی بادل نے ترا وش کی ہے۔ اشجار کی شاخیں اور طائروں کی نغمہ ریزی دونوں مفقود ہیں۔ نہ کہیں مرغزار ہے نہ رم آہو۔ اس کے بحر و بر روح کی تجلی سے خالی ہیں، زمین کا پیکر کہ طیلسان کی مانند ہے ایک پیچ و تاب کھاتے ہوئے دھوئیں پر مشتمل ہے، سبزہ باد بہار سے ناآشنا زمین کی گہرائیوں میں سویا ہوا ہے — ایسے وقت میں چرخ نیلی فام نے زمین کو یہ کہتے ہوئے طعنہ دیا کہ میں نے کسی کو بھی اس خستہ حالت میں نہیں دیکھا جس خستہ حالت میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔ میری وسعتوں میں تجھ ایسا کور چشم کہاں ملے گا۔ میری قندیل خورشید کے بغیر تو روشنی سے محروم ہے۔ خاک اگر بلندی میں کوہِ الوند بھی بن جائے تب بھی وہ خاک ہی ہے۔ وہ آسمان کی طرح روشن و پائندہ نہیں ہو سکتی یا تو دلبری کے ساز و سامان کے ساتھ بسر کر یا احساسِ کمتری سے مرجا۔

زمین آسمان کے اس طعنے سے شرمندہ ہوتی ہے اور اس پر نا امیدی، دلگیری اور اضمحلال غلبہ پا لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا کے حضور میں اپنی بے نوری پر تڑپ اٹھتی ہے حتی کہ آسمان کے اس طرف سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

اے امینِ از امانت بے خبر
غم مخور اندر ضمیرِ خود نگر

روزہا روشن ز غوغائے حیات
نے ازاں نورے کہ بینی در جہات

نورِ صبح از آفتاب داغ دار
نورِ جان پاک از غبار روزگار

نورِ جاں بے جادہ ہا اندر سفر
از شعاعِ مہر و مہ سیارہ تر

شستہ از لوحِ جاں نقشِ امید
نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند

راہ داں اندیشۂ او بے دلیل
چشمِ او بیدار تر از جبرئیل

خاک و در پرواز مانند ملک
یک رباطِ کہنہ در راہش فلک

می خلد اندر وجودِ آسماں
مثلِ نوکِ سوزن اندر پرنیاں

داغ ہا شوید ز دامانِ وجود
بے نگاہِ او جہاں کور و کبود

گرچہ کم تسبیح و خوں ریز است او
روزگاراں را چو مہمیز است او

چشم او روشن شود از کائنات
تا بہ بینید ذات را اندر صفات

یہی نظریہ اردو میں ایک اور انداز کا مینخانۂ الہام بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، جب روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے،

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے

تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبال خیر و شر کی بحث میں آزادی کو نیکی کے لیے ایک شرط قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ "انائے مقید جسے طرح طرح کے اعمال کی اضافی اقدار پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک طرزِ عمل کو منتخب کرنے کی قوت حاصل ہے ظہور کی اجازت دینا در اصل

ایک بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے، اور ذاتِ حق نے یہ خطرہ مول لینا قبول کیا تو محض اسلئے کہ اسے انسان کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔[1] اب یہ دیکھنا انسان کا کام ہے، کہ وہ اس بھروسے کا کیوں کر اہل ثابت ہو سکتا ہے، شاید یہ خطرہ مول لینے ہی سے ایسی مخلوق کی (جس کی تخلیق محض خیر کے تانے بانے سے ہوئی ہو اور پھر پست سے پست سطح پر اُسے لے آیا گیا ہو) امکانی قوت کا امتحان بھی لیا جا سکتا ہے، اور انھیں فروغ بھی دیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے کہا ہے، "اور پرکھنے کے لیے ہم تمھاری نیکی اور بدی سے آزمائش کرتے رہیں گے،[2]

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔[3]

اس لئے خیر اور شر متضاد کیفیتیں ہونے کے باوجود ایک ہی کُل کے جزو ہیں"۔

ان تمام حوالوں کے بعد یہ بحث یہاں پہنچی ہے کہ بقول اقبال انسان کی تخلیق تو خدا ہی کرتا ہے، لیکن اس کا ارتقا مادے (زمین) کا مرہون منت ہے، زندگی کی پہلی صورت بے شک ایک خلیاتی ہیئتِ اجتماعی ہو لیکن زندگی کا عروج (اشرف المخلوقات) انسان ہی ہے۔

اقبال کا نظریۂ انسان نظریۂ ارتقاء کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے ایک اپنا مفہوم عطا کرتا ہے، صرف نظریۂ ارتقاء ہی کیا، اقبال نے جو بھی عظیم نظریے ورثے میں پائے ہیں، انھیں بالعموم جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ انکی اپنے غور و فکر کے پیش نظر ایک نئی تفسیر پیش کی ہے، اس کتاب کا

---

[1] یہاں اقبال His immense faith in man کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ خدا کو انسان کی ذات میں بے انتہا اعتقاد تھا۔

[2] Recunstructir of Religious Thought in Islam میں اس آیت کا حوالہ بھی غلط دیا ہوا ہے، یہ طباعت ہی کی غلطی ہو سکتی ہے، دراصل یہ سورۃ الانبیا کی پینتیسویں آیت ہے نہ کہ چھتیسویں۔ (آزاد)

[3] ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے

جو آج Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے ہمارے سامنے ہے، ابتدائی مجوزہ نام تھا۔ Islam as I understand it حبِ وطن کا نظریہ اقبال تک پہنچا تو اقبال نے اسے ایک وسیع معنی پہنائے۔ اشتراکیت کا نظریہ اقبال کے سامنے آیا تو اسے بھی اقبال نے جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ اس میں روحانیت کا عنصر داخل کرنے کی کوشش کی۔ اقبال اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہوئے یا نہیں یہ ایک الگ بات ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال نے ہر نظامِ فکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور فکر و نظر کی روشنی میں اسے جانچنے پرکھنے میں مصروف رہے۔ نظریۂ عظمت انسان بھی انہی نظریات کے ذیل میں آتا ہے۔

جہاں تک ارتقاء کا تعلق ہے، اقبال مادے کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں، لیکن مادے کے متعلق ان کا نظریہ مادہ پرستوں والا نہیں بلکہ وہ مادے کو روح کا لباس ظاہری کہتے ہیں، مادہ اقبال کے نزدیک ایک "غیر نفس" یا "غیر انا" (Non-self) حقیقت ہے جسے انائے مطلق اپنے ظہور کے لیے پس منظر کے طور پر معرضِ وجود میں لائی ہے۔

اقبال کی شاعری اور نثر دونوں اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ اقبال ارتقاء کے قائل ہیں، اور تعلیم قرآن کی روشنی میں اس کا جواز بھی مہیا کرتے ہیں۔ پیام مشرق کی نظم "تسخیر فطرت" اس کی ایک عمدہ مثال ہے، جس میں ابلیس آدم کو "او بہ نہاد است خاک" کہہ کے اُسے سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے، اس ضمن میں انکارِ ابلیس کے ماقبل کے حصہ نظم کا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) طور پر مبتلا کرتے ہیں، اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے۔ (ترجمہ فتح محمد جالندھری) محمد پکتھل نے سختی اور آسودگی کی جگہ With evi and with good. لکھا ہے، جو یقیناً بہتر ترجمہ ہے، (آزاد)

آخری شعر اقبال کا نظریہ اور وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازین گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

ارتقاء کے بارے میں اقبال کے خیالات ایک منضبط انداز سے ہمیں اُن کی تصنیف Development of Tetaphyrics in Persia میں نظر آتے ہیں۔ اس ضمن مین اقبال نے ابن مسکویہ کے مختلف نظریات بالخصوص نظریۂ ارتقاء کو بڑی اہمیت دی ہے۔ "الکلام" میں مولانا شبلی نے ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقاء کا جو خلاصہ پیش کیا ہے اقبال نے اس کا مکمل طور پر حوالہ دیا ہے، اور اس سے قطعاً کوئی اظہار اختلاف نہیں کیا۔

ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقاء اور جدید نظریۂ ارتقاء میں اس قدر حیرت انگیز مماثلت کے باوجود اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس مماثلت کے اندر عدم مماثلت کے عناصر بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ابن مسکویہ کے نظریے کی بنیاد روحانیت پر ہے، اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی بنیاد مادیت پر۔ ابن مسکویہ اس سارے ارتقائی نظام کے لیئے مادے کو قطعی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک اس تمام ارتقائی سلسلے کا مخرج و منبع ذات حق ہے، نہ کہ مادہ۔ واجب الوجود صرف خدا کی ذات ہے۔ مادہ واجب الوجود نہیں بلکہ حقیقتِ مطلق کے صدور مظاہر کے عمل میں ایک مرحلہ ہے۔ اور اس مرحلے کی غرض و غایت یہ ہے کہ انجام کار اُسے اس منظر کے لیے پس منظر کا کام دینا ہے، جسے اشرف المخلوق یا انسان کہتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں ارتقاء کا یہ سارا سلسلہ بے مقصد نہیں ہے، بلکہ بامقصد ہے کیونکہ مشیت ایزدی کے مطابق اس سلسلۂ ارتقاء میں وہ لمحہ ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے، جب انائے مطلق کے مظاہر میں سے انائے مقید

اعلیٰ ترین اور اشرف ترین مظہر بن کے کائنات میں جلوہ افروز ہو۔ اقبال اسی نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں۔

پیکرِ ہستی ز آثار خودی است — ہرچہ مے بینی ز اسرار خودی است
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہان تخم خصومت کاشت است — خویشتن را غیر خود پنداشت است

یعنی انائے مطلق انائے مقید کے لیے سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے، انائے مطلق سے انائے مقید کے پھوٹنے کا عمل شاعرانہ الفاظ میں وہی ہے جو شعلے سے شرر کے پھوٹنے کا عمل ہے

ضمیرش بحرِ ناپیدا کنارے — دلِ ہر قطرہ موجِ بیقرارے
نہ او را بے نمودِ ما نمودے — نہ ما را بے کشودِ او کشودے
ہر دو برگ شکیبائی ندارد — بجز افرادِ پیدائی ندارد
حیات آتش خودی ہا چوں شررہا — چو انجم ثابت و اندر سفرہا
جہاں را از ستیزِ او نظامے — کفِ خاک از ستیزِ آئینہ فامے
درونِ سینۂ ما خاورِ او — فروغِ خاکِ ما از جوہرِ او

صرف انائے مقید ہی کیا اقبال کے نزدیک ساری حقیقت کائنات کا مخرج و منبع خدا ہی کی ذات ہے۔ یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کہ اقبال سلسلۂ ارتقاء میں ایک تمثیلی ظہور کے قائل ہیں یعنی کم سطح والے ظہور کے بعد اونچی سطح والا ظہور سامنے آتا ہے۔ اور ہر مرحلہ لامتناہی امکانات کا حامل ہوتا ہے، یعنی خلیے کے ارتقاء کی موجود صورت۔ انسان — ارتقاء کی قطعی اور آخری صورت نہیں ہے، انسان کے لیے ذہنی طور پر بھی اور عضویاتی طور پر بھی ابھی کئی ارتقائی مراحل منتظر ہیں۔ اقبال کی اس شعر

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے،

میں اشارہ صرف انسان کے خلا میں پرواز کی طرف نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس شعر میں اور بھی کئی اشارے مضمر ہیں۔ لفظ عروج ذہنی، روحانی اور جسمانی ہر طرح کی بلندی کے مفہوم کا حامل ہے۔ اس ضمن میں اقبال، روح اور جسم کو الگ الگ کر کے دیکھنے کے بھی قائل نہیں۔ انھیں روح یا جسم میں کوئی تناقض یا تضاد نظر نہیں آتا۔ روح اور جسم اقبال کے نزدیک ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ "جاوید نامہ" میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے کہ گوئی محملِ جان است تن   سِرِّ جان را در نگر بر تن متن

محملے نے حالے از احوالِ اوست   محملش خواندن فریبِ گفتگو است

چیست جان؟ جذب و سرور و سوز و درد   ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است   با مقامِ چار سو خو کردن است

گویا اقبال کے نزدیک انسانی جسم کی تخلیق کسی ایسے مادّے سے نہیں ہوئی جو روح سے قطعاً بے تعلق یا بے نیاز ہے، اور یہ بھی نہیں کہ جسم کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ روح اس میں قیام کر سکے۔ جسم بھی اسی حقیقت کا ایک پرتو ہے، جس کا ایک پرتو روح ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ الگ تصور کرنا اور الگ الگ بیان کرنا کوتاہیٔ فکر ہے، اور کوتاہیٔ زبان بھی۔ اس نکتے کو اقبال گلشن راز جدید میں یوں سحر کارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

تن و جان را دو تا گفتن کلام است   تن و جان را دو تا دیدن حرام است

بجاں پوشیدہ رمز کائنات است   بدن حالے ز احوالِ حیات است

عروسِ معنی از صورت حنا بست   نمودِ خویش را پیرایہ ہا بست

حقیقت روئے خود را پردہ باف است   کہ او را لذتے در انکشاف است

اقبال کے نزدیک جسم اور روح میں نہ کوئی دوئی ہے نہ کوئی مغارقت دونوں ایک ہی حقیقت کے مظہر ہیں، بلکہ اقبال تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں کی ساخت ایک ہی شے سے ہوئی ہے۔ روح بھی اعمال کے ایک نظام کا نام ہے، اور جسم بھی۔ دونوں کے اعمال میں کوئی حدِ فاصل قائم کرنا بھی ممکن نہیں۔ اقبال ایک چھوٹی سی مثال دے کر اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہتے ہیں جب میں میز پر سے کتاب اُٹھاتا ہوں تو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اس عمل میں میرے جسم کا کتنا حصہ ہے، اور روح کا کتنا۔ روح کے اظہار کے لیے جسم کی موجودگی ضروری ہے۔ لیکن اقبال کے بیان میں ایک الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ روح کی اہمیت جسم کے مقابلے میں زیادہ ہے، جہاں جسم اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لیے روح کا محتاج ہے، وہاں روح حقیقتِ ربانی کی محتاج ہے۔

یہاں اقبال روح کے بارے میں ایک اور لطیف نکتہ پیش کرتے ہیں۔ مسئلۂ ارتقاء کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ "ابن مسکویہ پہلا مسلمان تھا، جس نے نمودِ انسان کے متعلق ایک واضح اور کئی پہلوؤں سے ایک جدید تصور پیش کی۔" آپ کہتے ہیں کہ "رومی نے جب حیات جاوداں کے مسئلے کو حیاتیاتی ارتقار کا مسئلہ کہا اور بعض مسلمان مفکرین کے نظریے کے برعکس اسے ایک ایسا مسئلہ قرار نہ دیا جو خالص مابعد الطبعیاتی انداز کے دلائل سے حاصل ہو سکے تو رومی کا یہ اندازِ فکر قرآن کی روح کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ تھا، لیکن نئی دنیا کیلئے مسئلہ ارتقار امید اور جوش و ولولہ کا باعث نہیں بلکہ ایک پریشانی اور قنوطیت کا سبب

سبب بنتا ہے، اس کی وجہ یہ غیر مدلل جدید نظریہ ہے کہ انسان کی موجودہ ساخت، ذہنی بھی، اور نفسیاتی بھی، حیاتیاتی ارتقاء میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، اور موت جسے ایک حیاتیاتی وقوعہ سمجھا جاتا ہے، تعمیری مفہوم سے عاری ہے۔[1] یہاں اقبال یہ کہہ کر کہ دنیا کو اس وقت ایک رومی کی ضرورت ہے، جو انسان کے اندر ایک امید افزا ارادہ پیدا کر سکے اور اس کے دل میں زندگی کے لئے جوش اور ولولے کی شمع روشن کر سکے، رومی کے مندرجہ اشعار دہراتے ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے،

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اس کے بعد جیسا کہ تم جانتے ہو خالقِ اعظم نے انسان کو حیوانی حالت سے[2] انسانی حالت تک پہنچایا، چنانچہ انسان ایک فطری نظام سے دوسرے فطری نظام میں پہنچ گیا حتیٰ کہ وہ دانا اور توانا ہوگیا، جیسا کہ وہ اب ہے، اپنی اولین روحوں کے بارے میں اب اُسے کچھ یاد نہیں، اور اُسے موجودہ روح کی حالت سے بھی تبدیل کیا جائے گا۔[3]

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں، لیکن جس نکتے نے مسلمان فلسفیوں اور فقیہوں میں خاصا اختلاف رائے پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا انسان کے ظہور نو (بروز) کے معنی یہ ہیں کہ اُسے اپنا پہلا مادی (جسمانی) ذریعہ بھی عطا ہوگا۔ ان میں سے اکثر علماء،

---

[1] انسانی انا، اس کی آزادی اور حیات ابد (اقبال) [2] اس بات کے لیے میں معذرت خواہ ہوں کہ مثنوی مولینا روم کا نسخہ بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اقبال کے (فارسی سے) انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے (آزاد) معارف۔ وہ اشعار یہ ہیں،

باز از حیوان سوئے انسانیش　میکشد آں خالقے کہ دانیش

ہم چنیں از اقلیم تا اقلیم رفت　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقل ہائے اولینش یاد نیست　ہم ازیں عقلش تحول کردنیست

جن میں اسلام کے آخری عظیم فقیہ شاہ ولی اللہ بھی شامل ہیں اس خیال کے حامی ہیں کہ انسان کا ظہور نو (بروز) انا کے نئے احوال کو ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے کسی نہ کسی جسمانی ذریعے کا متقاضی ہوگا۔[1]

اس مقام پر آکر اقبال کا اضطراب قلبی اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور چونکہ رومی اور شاہ ولی اللہ کے نظریات اُن کے عقیدے سے ٹکراتے نظر آتے ہیں، اس لئے وہ سورۂ ق کی تیسری اور چوتھی آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے رومی اور شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کی تردید کرتے ہیں، اور کہتے ہیں "میرے نزدیک یہ آیات بڑی وضاحت سے کہہ رہی ہیں کہ کائنات کی ماہیت کے پیش نظر یہ بات ممکن ہے کہ انسانی اعمال کے قطعی جائزے کے لیے جس طرح کی انفرادیت کی ضرورت ہے اُسے کسی اور طرح برقرار رکھا جا سکے، یہ دوسرا طریقہ کیا ہے، اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے نہ ہی اس "تخلیق نو" کی ماہیت کے بارے میں ہمیں اس کے ساتھ جسم کا تصور وابستہ کرنے سے خواہ وہ کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو کوئی مزید بصیرت یا وقتِ نظری حاصل ہو سکتی ہے، قرآن کی یہ مطابقات ایک حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، لیکن اس کی ماہیت یا کردار کو فاش نہیں کرتیں، چنانچہ فلسفیانہ طور پر بات کرتے ہوئے ہم اس سے زیادہ آگے نہیں جا سکتے کہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے پیش نظر یہ انتہائی غیر اغلب نظر آتا ہے، کہ اس کا کیریر جسم کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جائے۔[2]

اس موقع پر اقبال کے مندرجہ ذیل خط کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جو انھوں نے اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا!۔

---

[1] انسانی انا، اس کی آزادی اور حیات ابد۔ (اقبال) [2] انسانی انا، اسکی آزادی اور حیات ابد (اقبال)

مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے،

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ ترین مخلوق کی آبادی ممکن ہے، اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے، ان کے اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہ تھی؟"

(مکاتیب اقبال صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷)

اب اس بحث کو ہم اقبال کی نظم و نثر کو بنیاد بنا کر دور تک نہیں لے جا سکتے، بالخصوص جب کہ اقبال خود یہ کہہ کر اس بحث کا دروازہ بند کر دیتے ہیں کہ "یہ دوسرا طریقہ کیا ہے ہم اسکے بارے میں نہیں جانتے۔ نہ ہی اس "تخلیق نو" کی ماہیت کے متعلق ہمیں اس کے ساتھ جسم کا تصور وابستہ کرنے سے خواہ وہ کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو کوئی مزید بصیرت حاصل ہو سکتی ہے"۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس بحث کا دروازہ بند کر دینے کے باوجود اقبال انسان کے اندر چھپے ہوئے امکانات اور ان امکانات کی روشنی میں عظمت آدم کا جو تصور پیش کرتے ہیں، وہ فکر اقبال اور شعر اقبال کی عالم انسانیت کو ایک دین ہے۔

فرہنگ جہانگیری کے نئے اڈیشن کے سلسلے میں کچھ گذارش

از جناب ریحانہ خاتون صاحبہ شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

بعض لحاظ سے فرہنگ جہانگیری کے فارسی زبان کی سب سے اہم فرہنگ ہے، اس کا مولف جمال الدین حسین انجوے شیرازی ہے، جس نے ۱۰۱۷ ہجری میں اس کو مکمل کر کے جہانگیر کے نام سے منسوب کیا، جمال الدین اپنے عہد کے سیاسی امور میں کافی دخیل تھا، ابتدائی زندگی احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت کے زیر سایہ گذری، وہاں کی مشہور ملکہ چاند بی بی کی بہن سے اسکی شادی ہوئی، پھر مغلیہ دربار سے وابستہ ہو گیا، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ترقی کے مدارج طے کئے، دکنی امور کا ماہر تھا، اس لئے مغل دربار کی طرف سے سفیر بنا کر دکن بھیجا گیا، اس کی زندگی سیاسی سرگرمیوں میں گذری، اس کے باوجود علمی و ادبی کاموں سے غافل نہ رہا، فرہنگ جہانگیری اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

اس فرہنگ کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں، ۱۲۹۳ ہجری میں لکھنؤ سے طبع بھی ہوئی تھی مگر اس میں طباعت کی اتنی زیادہ غلطیاں رہ گئیں کہ اس کی

افادیت میں بڑی کمی واقع ہوگئی، خوشی کی بات ہے کہ ۱۳۵۱ شمسی میں مشہد یونیورسٹی میں پہلوی زبان کے استاد ڈاکٹر رحیم عفیفی نے اس کا ایک ناقدانہ ایڈیشن مقدمے، تعلیقات اور فہارس کے ساتھ تیار کیا، جو اس یونیورسٹی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوا، ان کی ضخامت ۲۶۰۰ صفحات کی ہے، یہ مرتب و مصحح کی ایک بڑی علمی خدمت ہے، کتاب کی نفیس طباعت کی وجہ سے اس کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے،

اس قابل قدر اڈیشن میں اگر بعض امور کی طرف توجہ ہو جاتی تو اس کی قدر و قیمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا، مثلاً انتقاد متن کے متعلق دور جدید کا متفقہ اصول ہے کہ متن میں تاریخ، ادب، شعر وغیرہ سے متعلق جن چیزوں کا ذکر آیا ہو انکی نشاندہی ضرور ہونی چاہیے" اس کا علمی نام تخریج ہے، مصحح فرہنگ جہانگیری چند صفحات کے سوا اس پر سرے سے کاربند نہیں ہوئے ہیں، شعری، ادبی اور تاریخی امور کی نشاندہی کے بجائے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ مزید شعری و نثری شواہد پیش کریں، یہ بجائے خود مفید ضرور ہے، لیکن اگر صرف ان الفاظ و فقرات کے لیے شواہد نقل ہوتے جنکے شواہد فرہنگ جہانگیری میں نہیں ہیں، تو اس سے اس کی افادیت یقیناً بڑھ جاتی، لیکن چونکہ یہ التزام نہیں ہے، اس لیے اس ضخیم کتاب کا حجم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے،

تخریج کے اصول پر عمل کرنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو گمنام شعرا یا مصنفین متن میں مذکور ہوئے ہیں ان کے بارے میں کچھ تحقیق ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھی ایسی تحقیق سے بعض علمی و ادبی شخصیتوں کی گمنامی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، فرہنگ جہانگیری میں شعری شواہد تمام فرہنگوں سے زیادہ ہیں، جس طرح مولف کے پیش نظر ۵۳ فرہنگیں تھیں اتنی کسی اور فرہنگ نویس کے مطالعہ میں نہیں رہیں، اسی طرح جتنے شعری

نثری اور تاریخی شواہد اس میں موجود ہیں، فارسی کی کسی اور فرہنگ میں نہیں، اس لیے مولف کے پیش نظر ایسے متعدد شعرا کے دیوان تھے، جو آج یا تو مفقود ہیں یا بہت ہی کم لوگوں کی نظر میں ہیں، انتقادی متن کا تقاضا تو یہ تھا کہ فرہنگ کے تمام شواہد کے متعلق خاطر خواہ تحقیق ہوتی، لیکن اس انتہائی مشکل کام سے عہدہ برآ ہونا ایک تنہا شخص کے بس کی بات نہ تھی، ایک ادارہ کے ذریعے ایک طویل مدت میں یہ کام انجام پذیر ہو سکتا تھا،

ان گمنام شعرا میں کچھ ہندوستان کے بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں مصحح فرہنگ کا واقف نہ ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں،

جمال الدین حسین انجوے شیرازی نے یہ فرہنگ ہندوستان میں لکھی، اس بنا پر ہندوستانی عنصر کی زیادتی قدرتی امر ہے، ڈاکٹر عفیفی کے لیے ہندوستان کی تاریخ و جغرافیہ کا مسئلہ ہی کیا کم مشکل تھا کہ یہاں کی زبان و ادب سے واقفیت کی توقع کیجاتی،

ادھر فارسی فرہنگوں سے متعلق ہندوستان میں کچھ کام ہوا ہے، ان سے واقفیت فرہنگ جہانگیری کے انتقادی متن میں معاون ہوتی. جن فرہنگوں کا ذکر فرہنگ جہانگیری کے دیباچے میں ہوا ہے، ان میں سے بعض نہ صرف ہندوستان میں دستیاب ہوگئی ہیں بلکہ ان کے انتقادی متن تیار ہوگئے ہیں، اور ایک آدھ زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکی ہیں. اس کے بارے میں ڈاکٹر عفیفی مصحح فرہنگ جہانگیری کو واقفیت نہیں ہے، اس لیے ان کا یہاں مختصر طریقہ سے ذکر کیا جاتا ہے،

۱- فرہنگ ابوحفص سغدی پر قاضی عبد الودود صاحب کا مقالہ

(چاپ مجلۂ علوم اسلامیہ جلد اول سال اول)

۲- فرہنگ جہانگیری کے مولف کے حالات از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ علوم اسلامیہ جلد اول سال اول)

۳۔ فرہنگ زفان گویا، از پروفیسر سید حسن۔

(مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۳ء)

۴۔ فرہنگ زفان گویا میں ہندوستانی عنصر از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ اردو کراچی ۱۹۶۰)

۵۔ فرہنگ ادات الفضلا میں ہندوستانی عنصر از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ اردو کراچی ۱۹۶۷)

۶۔ فرہنگ دستور الافاضل از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ انڈو ایرانیکا کلکتہ ۱۹۶۸)

۷۔ فرہنگ فخر قواس از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۵)

۸۔ تحفۃ السعادہ یا فرہنگ اسکندری از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ہفتم)

۹۔ مدار الافاضل جو فرہنگ جہانگیری میں فرہنگ اللہ داد سرہندی کے نام سے مذکور ہے، ڈاکٹر محمد باقر کے اعتناء سے لاہور سے طبع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس پر ایک مفصل تبصرہ "تحریر" کے شمارہ ۸ میں شائع کیا ہے۔

۱۰۔ مجمع الفرس سروری۔ از ڈاکٹر نذیر احمد۔ (معاصر پٹنہ)

فرہنگ جہانگیری کے ماخذ کی دو اہم فرہنگیں فرہنگ فخر قواس اور فرہنگ دستور الافاضل ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کو ایڈٹ کیا، اول الذکر طبع ہو چکی ہے، ان دونوں فرہنگوں کا ایک ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں موجود ہے، انکے

کسی دوسرے نسخے کا علم نہیں۔ ڈاکٹر شہریار نقوی نے اپنی کتاب "فرہنگ نویسی" میں سہواً اس کے ایک نسخہ بھوپال (ہند) کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کی کتاب پر جو تبصرہ راہنمای کتاب (تہران) میں شایع کیا تھا، اس میں اس غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فرہنگ جہانگیری میں زفان گویا سے بھی استفادہ ہوا ہے، اس فرہنگ کے دو نسخے حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں، ایک پٹنہ میں خدا بخش خاں اورینٹل لائبریری بانکی پور میں ہے، دوسرا نسخہ لینن گراڈ میں محفوظ ہے۔

فرہنگ شرفنامہ کا ایک ناقدانہ ایڈیشن ڈاکٹر سید طارق حسن شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے تیار کیا ہے۔

مذکورۂ بالا فرہنگوں میں سے کسی متن کی صحت میں بھی پوری مدد ملتی ہے، فرہنگ جہانگیری کے موجودہ مصحح نے استفادہ نہیں کیا ہے، صرف ایران میں چھپے ہوئے لغات مانند فرہنگ اسدی، صحاح الفرس معیار جمالی، مجمع الفرس وغیرہ سے مدد لی ہے۔

ادات الفضلا کے مصنف کی نسبت فرہنگ جہانگیری کے مقدمے میں دھاریوال درج ہے، اگرچہ اس کے خطی نسخوں میں یہ لفظ دھاروال ہے، لیکن ڈاکٹر عفیفی نے ڈاکٹر شہریار نقوی کی کتاب "فرہنگ نویسی" کی روایت کی بنا پر دھاروال پر دھاریوال کو ترجیح دی، حالانکہ دھاروال صحیح اور دھاریوال غلط ہے، دھار مالوہ میں ایک مشہور تاریخی مقام تھا، اور شاہان مالوہ میں سے دو بادشاہ دلاور خاں اور ہوشنگ کا دار الخلافہ رہ چکا تھا، ادات الفضلا کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی خان بدر دہلوی دھار میں سکونت پذیر تھا، اسی وجہ سے وہ دھاروال کی نسبت سے معروف ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے "فرہنگ نویسی" پر تبصرہ کرتے وقت اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے،

نیز ادات الفضلا والے مضمون (شامل مجلہ اردو اکتوبر ۱۹۶۷) میں ص ، پر اسکی بحث ہے۔

ہندوستان کے بعض ایسے گمنام ہندوستانی شعرا کے بارے میں کام ہوا ہے، جن سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، ان شعرا کے کلام سے واقفیت ہوتی تو فرہنگ جہانگیری کی تصحیح میں موثر ہو سکتی تھی، اور بعض جگہ جو سہو ہوا ہے اس سے بچا جا سکتا تھا، ذیل میں اس سلسلے کے بعض امور کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ فہرست گویندگان (ص ۴، ۲۵) میں بدر الدین شاشی اور بدر چاچی دو الگ الگ شاعر قرار دئے گئے ہیں، دراصل یہ ایک ہی شاعر ہے، جس کا تعلق محمد بن تغلق (م: ۷۵۲ھ) کے دور سے تھا، اس کے قصائد عرصۂ دراز تک ہندوستان کے فارسی نصاب میں شامل رہے ہیں، یہ قصائد کا مجموعہ کئی بار طبع ہو چکا ہے، بدر ترکستان کے شہر چاچ کا باشندہ تھا عربی میں چاچ شاش ہے، اسی وجہ سے وہ دونوں نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، بدر چاچ کے قصاید کے مجموعے کا ذکر مصحح کے ماخذ کتب میں موجود نہیں،

۲۔ برہان الدین بزاز التتمشی، (م: ۶۳۳ھ) کے عہد کا شاعر ہے، "کاغ کاغ" کی اس کی ایک بیت شاہد کے طور پر (۱: ۲۹۴) منقول ہے، دراصل یہ بیت ایک ترجیع بند سے ماخوذ ہے، جو التتمش کی مدح میں لکھی گئی تھی، یہ "مونس الاحرار" تالیف کلاتی اصفہانی (سال تالیف ۷۴۱ھ) ص ۱۰۸۰-۱۰۸۲) نسخہ کتاب خانہ مولانا آزاد، دانشگاہ علی گڈھ[۵] اور تذکرہ خلاصۃ الاشعار۔ مولفہ تقی کاشی کے اس حصے میں موجود ہے، جو خود مولف کے قلم سے نسخہ باگی پور میں لی گئی ہے۔ (ورق ۲۹۰) برہان الدین بزاز کا ذکر، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان بلبن کے عہد میں بھی زندہ تھا، بزاز کا یہ منظومہ ڈاکٹر ماریہ بلقیس کے مقالہ بعنوان ،گرداوری،

اشعار پراگندہ" میں مکمل طور پر درج ہے،

۳۔ تاج الدین بخاری کے کلام سے فرہنگ جہانگیری میں استفادہ ہوا ہے، بخاری بھی سلطان شمس الدین التتمش کے دور سے تعلق رکھتا تھا، تذکرہ خلاصۃ الاشعار کے ملحقہ حصے اور تذکرہ عرفات عاشقین میں اس کے تین منظومے درج ہیں، ان کی دوسے ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے ان تینوں نظموں کا ایک ناقدانہ متن اپنے مقالے میں شامل کر لیا ہے،

۴۔ حمید قلندر فیروز شاہ تغلق کے دور کی اہم شخصیت ہے، وہ صاحب دیوان شاعر تھا، مگر اس کا دیوان اب نہیں ملتا، البتہ ڈاکٹر نذیر احمد کو اس کے کئی قصیدے ملے ہیں، جن پر مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۵ میں ایک تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے، حمید قلندر نے چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس کے عنوان سے جمع کئے تھے، جس کو پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے شایع کیا ہے، فرہنگ جہانگیری میں، حمید قلندر کے دو اشعار سے استشہاد ہوا ہے، مگر یہ دونوں اشعار ڈاکٹر نذیر احمد کو نہیں ملے۔

۵۔ سراج الدین سگزی کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری میں منقول ہیں، اس شاعر کے دیوان کے ۲ دو نسخے ڈاکٹر نذیر احمد کو ملے، ان کا باہمی مقابلہ کرکے اس کا ایک انتقادی ایڈیشن انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے شایع کیا ہے، مصحح فرہنگ جہانگیری کو اس دیوان سے استفادے کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ اس کی اشاعت سے قبل ہی فرہنگ جہانگیری کا کام ختم ہو چکا تھا، بہر حال اس سلسلے میں کچھ مزید وضاحت درج کی جاتی ہے۔

ص ۱۸۷۔ حسب ذیل بیت کلمۂ بادرنگ (بمعنی بیماری) کی توضیح کے لئے درج ہوئی ہے۔

داردغم بادرنگ عشقت در بردن جان من شتابی

لیکن علامہ دہخدا نے فرہنگ جہانگیری کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے، اگرچہ جہانگیری کی پیروی میں رشیدی وغیرہ میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، اور سراجی سگزی کی بیت بطور شاہد درج ہوئی ہے بلکہ علامہ دہخدا لکھتے ہیں،

بادرنگ مرکب از "با" معنی مع، "دادرنگ" معنی البطرہ، بقرینۂ شتاب

درمصراع دوم (لغت نامہ ص ۲۳۰)

یہ بیت ایک قصیدہ کی ہے، جو سلطان التمتش کے بیٹے ناصرالدین محمود کی مدح میں اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ای حسن ترا ز لطف آبی وی زلف ترا ز مشک تابی (دیوان ص ۲۸)

ص ۳۸۶ - حسب ذیل بیت کلمۂ شادیچہ (بمعنی بالاپوش یعنی لحاف) کے معنی کیلئے بطور شاہد آئی ہے،

گل چو از شادیچۂ رومی برون آمد بباغ

زندوافش ہیچو اسقف زندخوان آمد بردن

یہ بیت نصرت الدین ابوالخطاب خسرو پادشاہ مکران کی مدح میں ہے، جس کا مطلع یہ ہے:۔

باز نوروز قدیم اندر جہان آمد بردن ابر نوروزی ز دریا درفشان آمد بردن

(دیوان ص ۲۵۲)

ص ۹۳۷-۹۳۶ - سراجی کی حسب ذیل بیت چردہ بمعنی رنگ دلوں کے لئے بطور شاہد آئی ہے!

ز صنع اوست کہ شب چون سیاہ چردہ شود

سپہر سبز قبا سرخ رو شود ز شفق

یہ بیت سراجی کے قصیدہ درحمد" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلع یہ ہے:۔

مقدری کہ باطراف قلزم ازرق بحکم اوست روان جرم آتشین زورق

(دیوان ص ۲۰۵)

ص ۱۲۵۸ - اسپیجاب [اسفیجاب] ماوراءالنہر کا شہر ہے، اس کے لیے سراجی کی یہ دونوں ابیات بطور شاہد درج ہوئی ہیں:۔

چشم ملکت را بروی روم و قسطنطین نظر

چشم جاہت را بسوی چاچ و اسپیجاب روی

سند جو دش فلک در روم و قسطنطین نہاد

مقصد شکرش جہان در چاچ و اسپیجاب یافت

دیوان سراجی میں یہ دونوں بیتیں دو الگ الگ قصیدوں میں درج ہیں جن کے مطلعے ہیں،

اے چو نرگس چشم و ہمچون لالہ سیراب روی چند بینی رخت از چشم من سیلاب روی

(دیوان ص ۳۰۳)

دلربائی تربیت ز آن سنبل پرتاب آفتاب جانفزائی تقویت زان شکرین عناب یافت

(دیوان ص ۶۵)

ص ۱۰۵۶ - افراسیاب بحذف الف اول بھی آیا ہے، اس کی سند کے لئے سراجی کی یہ بیت نقل ہوئی ہے:۔

کیخسرو ثانی آنکہ آمد ہر بندۂ او افراسیابی (دیوان ص ۲۸۲)

یہ اسی قصیدہ کی بیت ہے جس کا مطلع ص ۱۸۰ پر بحث کے ضمن میں نقل ہو چکا
ہے، ص ۱۳۱۲۔ شست بمعنی حلقۂ رسن وکمند زلف کے لئے سراجی کی حسب ذیل
دو ابیات نقل ہوئی ہیں۔!

گرچہ میم وجیم گشتم از دل وقامت رواست
کان دہان ہمچو میمش دیدم وزلف چو جیم
درمیان جیم پیچہ شست دارد جان شکار
درمیان میم دارد سی و دو در یتیم

یہ سراجی کے ایک قصیدہ کی دوسری وتیسری بیتیں ہیں جس کا مطلع یہ ہے،

زآن دہان ہمچو میم وزآن دو زلف ہمچو جیم
پشت خم گشتم جو جیم وتنگ دل ماندم چو میم
(دیوان ص ۲۳۵)

ص ۱۴۹۰۔ کفچگ بمعنی دامن زین کی سند میں سراج الدین سگزی کی یہ بیت
مندرج ہے!۔

از پی کفچگ زین فرست صاحب خلد گر بخواہی دہد از چادر حور اطلس (دیوان صـ ۱۹۴)

یہ بیت ایک قصیدے سے ماخوذ ہے، جو سلطان تاج الدین ابو المکارم بادشاہ
مکران کی مدح میں ہے، اور جسکی ردیف اطلس ہے، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے!۔

ای بر اندام چو دیباے تو زیبا اطلس چند پوشی تو بر اندام چو دیبا اطلس (دیوان صـ ۱۹۳)

ص ۲۳۵۴۔ نیلوفر بخدمت دادو بھی آئی ہے، اور اسکی سند کے لیے سراجی کی

حسب ذیل بیت پیش ہوئی ہے!

رزم تو نو بہار شد زانکہ درو برآورد نیلوفر حسام تو از تن خصم ارغوان (دیوان صـ ۲۴۶)

دیوان سراجی میں یہ بیت ایک قصیدہ میں شامل ہے جس کا مطلع یہ ہے!۔

دوش کہ دید بوالعجب بہرۂ مہر از نہان کرد بزیر حقہ از زمی لباط آسمان (دیوان صـ ۲۴۴)

۲۔ شہاب مہمرہ کے اشعار فرہنگ جہانگیری میں درج ہیں، شاعر مذکور التتمش
اور رکن الدین فیروز شاہ (م: ۶۳۴ھ) کے عہد میں گذرا ہے، حمد اور نعت میں بڑے
اچھے قصائد لکھے تھے، مگر دیوان ناپید ہے، تقریباً ۹ قصیدے اور چند نظمیں جو مونس الاحرار
کلاتی، مونس الاحرار جاجرمی، منتخب التواریخ بدایونی، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی، عرفات
عاشقین وغیرہ میں ملتے ہیں، ان سے ان کی قادر الکلامی کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ یہ سارا
کلام ڈاکٹر ماریہ بلقیس کے مقالے۔۔ "Collection and Edition of
scatterd verses ۔ میں شامل ہے۔!

ڈاکٹر اقبال حسین کی کتاب Early Persian Poets of India۔
تالیف شمس العلماء پروفیسر عبد الغنی اور Pre Mughal Persian-
بزم مملوکیہ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن میں اس شاعر پر مفصل بحث شامل ہے،

۷۔ حکیم طرطی کے کلام سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، اس کا بھی تعلق
ہندوستان سے تھا، اس کا ایک قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے، مونس الاحرار کلاتی
ص ۹۱۳۔ اور تذکرہ خلاصۃ الاشعار ورق ۲۳۰ پر نقل ہے!

ہست گوئی عارض آن ترک زیبا آفتاب
گر بود ممکن کہ دارد برج دیبا آفتاب

۸۔ ظہوری (نورالدین) اور میر محمد طاہر ظہوری ترشیزی فہرست گویندگان میں دو الگ الگ جگہ (ص ۲۵۰۰، ۲۵۸۰) مذکور ہیں، اس سے واضح ہے کہ مصحح فرہنگ جہانگیری کے نزدیک یہ دونوں الگ الگ شاعر تھے، مگر یہ قیاس غلط ہے، ظہوری کا نام نورالدین محمد تھا، میر محمد طاہر کوئی دوسرا شخص تھا، ظہوری سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مصحح نے ج ۲ ص ۲ کے حاشیہ میں نتائج الافکار کے حوالے سے اس شاعر کا غلط نام میر محمد طاہر درج کیا ہے، اگرچہ یہ بات عموماً مشہور ہے کہ ظہوری ترشیزی ہے، مگر یہ بھی غلط ہے، کیونکہ خود ظہوری نے قائن کو اپنا وطن قرار دیا ہے، چنانچہ ساقی نامہ میں لکھتا ہے:۔

برستاق قائن فتادش عبور ظہوری از و کرد شہری ظہور

ڈاکٹر نذیر احمد نے "Zuhari's life and works" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، اس میں ان سارے امور پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، ظہوری کا دیوان، ساقی نامہ، سہ نثر چھپ چکے ہیں، مگر مصحح جہانگیری کے مراجعہ کتب میں ظہوری کی کوئی کتاب شامل نہیں، گو اس کے اشعار اس فرہنگ میں جابجا نقل ہوئے ہیں۔

۹۔ عمید لوکی نام کے شاعر کے کافی اشعار سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، عمید سلطان ناصرالدین محمود (م ۶۵۸ھ) اور سلطان بلبن کے عہد میں گذرا ہے، اس پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی کتاب بزم مملوکیہ میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے کافی اشعار، ڈاکٹر نذیر احمد کو مل گئے، چنانچہ انھوں نے مجلہ فکر و نظر دانشگاہ علی گڑھ، سال ۱۹۶۳ میں اس پر ایک مفصل مقالہ سپرد قلم کیا تھا، پھر اس کے سارے اشعار یکجا کر کے ایک مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے M. A. کے Dissertation کے طور پر پیش کیا، جو بعد میں مزید ترمیم و اضافہ کے بعد ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں

شامل ہوئے، حال ہی میں ڈاکٹر نذیر احمد کو عمید کا ایک چھوٹا مجموعۂ دیوان مل گیا ہے، جو حمد و نعت اور دوسرے منظومات پر مشتمل ہے، اس دیوان سے بعض اہم باتیں معلوم ہوئیں، مثلاً عمید سنامی تھا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس کی دوسری نسبت کے بارے میں سخت اختلاف ہے، فرہنگ جہانگیری کے نسخۂ اساس میں لوکی ہے، جو صحیح ہے، مگر مصحح نے اس کے بجائے ہر جگہ لولکی کو درست قرار دے کر داخل متن کیا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کو تولکی سمجھا تھا، لیکن خود عمید کے اپنے بیان کی رو سے اس کا تعلق لویک سے تھا، وہ کہتا ہے!

نسب از عمر بذیرم حسب از تبار لویک بکدام سلک دیدی دو گہر چنین منظّم
فلکا بزیر سقفت چو عمید لویکی کس ننہد بکاخ معنی ز چنیں قصیدہ سلّم

یہ ابیات ایک قصیدہ کی ہیں جس کا مطلع یہ ہے!

چہ دہر مرا زمانہ بکف از چمانہ غم بنشاط بزم گیتی قدح ستم دمادم

اس قصیدہ کو سیف جام ہروی نے مجموعۂ لطائف، تقی کاشی نے خلاصۃ الاشعار اور دوسری کتابوں میں بھی، نظامی گنجوی کی طرف منسوب کیا ہے، مگر صاحب گنجینۂ گنجوی نے لکھا ہے، کہ نظامی کی طرف اس قصیدہ کی نسبت غلط ہے، یہ قصیدہ صفوی دور کے کسی نظامی تخلص کے شاعر کا ہوگا، اس میں شبہ نہیں کہ صاحبِ گنجینہ کا یہ قیاس تو صحیح ہے کہ یہ قصیدہ نظامی کا نہیں ہے، لیکن اس کو عہد صفوی کا قرار دینا سراسر بے انصافی ہے، اس لئے کہ اس قصیدہ کی زبان بہت قدیم ہے، اس کے علاوہ سیف جام کا مجموعہ عہد صفوی سے بہت پہلے یعنی اوائل نویں صدی میں مرتب ہو چکا تھا، پھر دیوان عمید میں اس کی شمولیت سے اس سلسلے کی ساری قیاس آرائیاں ختم ہو جاتی ہیں،

عمید لویکی کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری، فرہنگ سروری اور فرہنگ رشیدی وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں، اول الذکر فرہنگ میں ان اشعار کے علاوہ جو مذکورۂ بالا قصائد میں کم از کم ۹۵ متفرق اشعار منقول ہیں، یہ سارے اشعار ڈاکٹر ماریہ بلقیس کے مقالے
Collection and Edition of scatterd verses
میں یکجا کر دیے گئے ہیں، ادبی تاریخ کے سلسلے سے یہ چیز نہایت درجہ اہم ہے کہ ایک شاعر جس کا دیوان موجود نہ ہو، اس کے کلام کا اتنا معتدبہ حصہ محض ایک کتاب سے حاصل کر لیا جائے، اسی بنا پر مجھے ڈاکٹر عفیفی کے اس طریقۂ کار سے اتفاق نہیں ہے کہ شعرا کی فہرست میں صفحات کی تعداد نہ درج کی جائے، عمید کے کلام سے ایسے وافر شواہد اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ دسویں صدی تک نہ صرف اس کا دیوان ملتا تھا، بلکہ وہ معروف و مقبول شاعر تھا، تاریخ ادب کے ایسے گوشے اسی طرح کی کتابوں کے مطالعہ سے روشن ہوتے ہیں، اس لیے کتاب کی اشاعت میں اس امر کا خصوصی لحاظ رکھا جائے کہ گمنام شعرا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔

ذیل میں عمید کے ایسے اشعار کی نشاندہی کی جاتی ہے جو اس کے قصائد میں شامل ہیں!

اس کے ایک مشہور حمدیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

اے از نہیب حکم تو خم زدہ قامت فلک   خطبۂ کبریائے تو وحدک لاشریک لک

یہ قصیدہ دیوان کے علاوہ منتخب التواریخ بدایونی اور مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف تالیف سیف جام ہروی میں شامل ہے، اس کے تیرہ[۱۳] ابیات فرہنگ جہانگیری میں مختلف معانی کے شواہد کے طور پر نقل ہوئی ہیں، ظاہر ہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی منظومہ کے ۱۳ ابیات شواہد میں نقل کیے جائیں، اس سے ایک طرف تو اس منظومہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور دوسری طرف مصحح کی ذمہ داری اس قصیدہ کی تلاش کے سلسلے میں

اور بڑھ جاتی ہے۔

عمید کا ایک قصیدہ مناظرۂ شراب و بنگ کے عنوان سے مجموعۂ لطائف، خلاصۃ الاشعار اور عرفات عاشقین میں درج ہے، اس کی دو بیتیں فرہنگ جہانگیری میں نقل ہوئی ہیں، ایک شرنگ کے ذیل میں جو نسخۂ مشہد میں موجود نہیں، مگر یہ نسخۂ لکھنؤ ج اول ص ۸۰۳ میں موجود ہے، دوسری شنفترنگ کے ذیل میں، اس دوسری بیت کی جو صورت فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے، وہ اپنی اصل سے بہت مختلف ہے؛

فرہنگ جہانگیری	مجموعۂ لطایف وغیرہ
نقل تو خشک میوہ و نقل منست تر چون سیب و آبی و شکر امرود و شنفترنگ	نقلت ہمیشہ باد ہمہ سیب رنگی باد اغذاے خصم تو نقل خزان عنگ

ان دونوں صورتوں کے اندراج پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تھی ایک دوسرے حمدیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

بر خیز عمید از نہ فسردست دل تو   بگذر ز غزل حمد خداوند جہاں گو

یہ قصیدہ صرف منتخب التواریخ بدایونی میں درج ہے، اس کی حسب ذیل تین ابیات فرہنگ جہانگیری میں بطور شاہد نقل ہوئی ہیں۔

صنعش بسر کوہ برد یا نہ وشقایق   در باغ و ماندہ لطفش سوری داتو (۱/۶۴)

ــــــــــ ۰ ــــــــــ

ہان تا ندھی گوش بہ آواز دف و چنگ   ہان تا نکنی راے صراحی کلاجو (۲/۱۶۳۹)

ــــــــــ ۰ ــــــــــ

با حکم قدیم تو چہ کسری و چہ قیصر   در پیش قضاے تو چہ خاقان و چہ تنگو (۲/۲۲۰)

منتخب التواریخ میں تنگو کے بجائے ہلاکو ہے، جب کہ جہانگیری میں "تنگو" کی توضیح کے لیے یہ بیت نقل ہوئی ہے، صاحب فرہنگ جہانگیری اور صاحب منتخب التواریخ دونوں ہم عہد تھے، مگر ان کے پیش نظر دیوان عمید کے جو نسخے تھے، ان میں اختلاف

موجود تھا، اس اختلاف کی وجہ بتائی جاتی تو مصحح کی تنقیدی نظر قابل وقعت ہوتی۔

۱۵۔ مطہر، مطہر کرہی، مطہر کرئی فہرست گویندگان ص ۲۵۰۹ میں الگ الگ درج ہوئے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصحح فرہنگ جہانگیری کے نزدیک یہ تین مختلف شاعر تھے، لیکن، ڈاکٹر نذیر احمد کا خیال ہے کہ تینوں ایک ہی شاعر ہیں، مطہر اور مطہر کرئی کے ایک ہونے میں کوئی سقم نہیں، سوائے اس کے کہ ایک میں وطنی نسبت درج نہیں ہوئی کرہی کرئی کی تصحیف معلوم ہوتی ہے، مطہر کرئی وہی ہے، جو مطہر کرہ کے نام سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، یہ فیروز شاہ تغلق (م:۔ ۷۹۰) کے عہد کا باکمال شاعر ہے، اس کا دیوان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے ایک رکن ڈاکٹر عبد الرزاق نے مرتب کیا ہے، مگر ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا، دیوان کے چند نسخے ملتے ہیں، جن پر اورینٹل کالج میگزین لاہور میں کافی بحث آچکی ہے، اس کے نصیبہ اخوان کو جو فراہی کے نصاب صبیان کے طرز کا منظوم رسالہ ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے ایڈٹ کر کے مجلۂ علوم اسلامیہ میں شائع کیا ہے، بہر حال اگر قلمی دیوان تک مصحح فرہنگ جہانگیری کی رسائی نہ تھی تو شاعر کی حیثیت کے تعین کرنے میں ان کو کوشش ضرور کرنی چاہئے تھی،

۱۱۔ ملک عزیز اللہ بظاہر وہی شاعر ہے، جو شرقی سلاطین میں سے مبارک شاہ شرقی، (م:۔ ۸۰۳) سے متعلق تھا، اس کا ایک طویل منظومہ سیف جام ہروی کے مجموعہ لطایف وسفینۂ ظرائف میں مندرج ہے، جس کو ڈاکٹر نذیر احمد نے مجلۂ فکر و نظر میں شائع کیا ہے،

۱۲۔ مولانا مغیث ہانسوی محمد تغلق (م:۔ ۷۵۲)، کے عہد کا شاعر ہے، یہ ہانسی کا رہنے والا تھا، اس کے چند قصیدے مجموعۂ لطائف میں منقول ہیں، جن کو ڈاکٹر نذیر احمد نے

مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۵ کے ذریعے روشناس کرایا ہے، اس کی ایک نثری تالیف کا ذکر قوام بلخی نے بحر الفضائل میں کیا ہے، مولانا مغیث کے بیٹے مولانا ہمام کے بارے میں ہمیں کچھ اطلاع نہ تھی، فرہنگ جہانگیری میں ان کے اشعار کے شمول سے واضح ہوا کہ وہ بھی شاعر تھے۔

۱۳۔ یوسفی طبیب کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری میں ہیں وہ ہرات کا باشندہ تھا، بابر کے عہد میں ہندوستان آیا اور شاہی طبیب ہوا، ہمایوں کے عہد میں دار الانشا بھی اس کے سپرد کیا گیا، چنانچہ انشا پر اس کی کتاب طبع ہو چکی ہے، اس کا دیوان جو قصائد پر مشتمل ہے، مدراس یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ شرقیات میں موجود ہے، اس کے متعدد منظوم طبی رسائل ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد طیب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا موضوع یہی طبیب تھا،

ڈاکٹر رحیم عفیفی نے قارئین کی سہولت کے لئے فرہنگ جہانگیری کے سارے لغات حروف تہجی کے اعتبار سے آخر کتاب میں دو سو سے زائد صفحات (۱، ۳۳۔ ۲۵۰۲) میں جمع کر دیا ہے، اس فہرست میں ہندی اور ترکی وغیرہ کے ایسے الفاظ بھی شامل ہیں، جو فرہنگ میں "لغت" کے طور پر نہیں بلکہ مترادف لفظ کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں، ان کی یہ کوشش نہایت سود مند ہے، لیکن غیر زبانوں کے الفاظ کی تلاش اور ان کی صحیح املائی صورت کے تعین میں ان کو جن زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ ہر شخص نہیں لگا سکتا، ہندی الفاظ کے تعین کے سلسلے میں دشواریاں اور زیادہ ہیں، اس لئے کہ ہندوستان کی بعض آوازوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ کھ۔ گھ۔ تھ۔ ٹھ۔ بھ۔ پھ۔ چھ۔ وغیرہ کے لئے فارسی حروف تہجی میں الگ حروف موجود نہیں چنانچہ جن الفاظ میں یہ حروف ہیں ان کے بجائے سادہ حروف، ت۔ د۔ ڑ۔ ک۔ گ۔ ت۔ ب۔ ج۔ پ۔ چ وغیرہ

استعمال ہوئے ہیں، اس عمل سے جو دشواریاں ہیں وہ اہل بصیرت پر پوشیدہ نہیں۔ رسم خط کی دشواری کے ساتھ ساتھ بعض جگہ ہندی الفاظ کے تعین میں دوسری طرح کی بھی خامیاں نظر آتی ہیں، لیکن مصحح کی یہ کاوش بڑی قابل ستائش ہے، ذیل میں اس سلسلے کے بعض امور کی نشاندہی کی جاتی ہے!

ارکیا ہندی۔ ۲/۱۶۴۰

بظاہر چھاپے کی غلطی کی وجہ سے ارکیا ہندی درج ہوگیا، اصل متن میں اس کو یونانی بتایا گیا ہے، اور ہندی مترادف مکڑی کا جالہ (= جالا) ہے،

انگلبیرہ۔ ۱/۱۳۴۲، ۲/۱۹۸۶

دراصل بائے فارسی یعنی پے سے لکھنا درست ہے، انگل پیرہ، انگل = انگلی، پیرہ: پیرا، درد۔

۱/۱۸۷ بادگولہ، بادرنگ کا مترادف ہے، جس سے آنتوں میں مروڑ ہوتا ہے، یہ بادگولہ (= گولہ) ہے، "د" "ر" کی تصحیف ہے اور "گاف" کا قدیمی املا "کاف" درست نہیں پڑھا گیا۔ ہائے مختفی تقریباً سارے الفاظ میں الف کی جگہ استعمال ہوئی ہے۔

۱/۱۹۰، ۲۰۰، ۲/۱۶۳۶ بار ہندی لفظ قرار دیا گیا ہے، مگر یہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس لئے کہ اصل متن میں یہ ہندی لفظ نہیں بتایا گیا ہے،

بگری ۲/۱۹۰۴ خول وجل کے مانند کوئی چڑیا ہے، جو راستے میں بیٹھتی ہے، اس تشریح سے واضح ہے کہ موجودہ بگری سے اس کا تعلق نہیں، یہ کوئی اور لفظ ہے، جس کی قرأت مشتبہ ہے۔

بل ۲/۱۶۲۵، ۲۲۲۹ شبل میوۂ باشد گرد مانند بہی، آنرا بل نیز خوانند و بزبان ہندی بیل خوانند (۱۶۲۵)

بیل ہندی باشد و آنرا بل نیز نامند و از آن مربا پزند و اہل ہندوستان بجائے بل آنرا

مربائے بیل گویند (۲۲۲۹)

ہندوستان میں "بل" کے بجائے بیل ہی کہتے ہیں، بل فارسی ہے، اس کو ہندی قرار دینا درست نہیں۔

بنج ۲/۱۱۳۱ آبی باشد کہ در حین پختن پلا خشکہ از خشکہ پلاد بگیرند و آنرا بہندی بنج خوانند، واضح ہے کہ یہ لفظ پیچ پیچھ ہے، جو آج بھی متداول ہے، مصحح فرہنگ نے درست نہیں لکھا۔

بھردہ ۱/۹۷۳ موجودہ تلفظ میں بھرڑدا ہے۔

بیرہ۔ ۲/۲۰۱۷ زدالہ گلولۂ آرد را گویند کہ بمقدار نانی علیحدہ ساختہ باشند و آنرا بہندی بیرہ خوانند، صحیح ہندی لفظ پیڑا ہے، جو آج بھی متداول ہے، بیرہ دوسرا ہندی لفظ ہے،

بیلو: ۱/۲۷۳ درخت اراک بود کہ از چوب آن مسواک سازند.... بزبان ہندی بیلو خوانند، واضح ہے بیلو کے بجائے صحیح لفظ پیلو ہے، جس کی مسواک کثرت سے مستعمل ہے،

پادلی۔ ۱/۲۴۵ چاہی را خوانند..... و بہندی پادلی گویند۔

صحیح لفظ بادلی (بائے عربی سے) ہے، پادلی غلط ہے۔

پتیل، ۱/۸۹۰ برنگ نوعی از فلزات بود کہ آنرا برنج خوانند و بہندی پتیل خوانند۔ پتیل غلط ہے، پیتل (یائے مقدم) صحیح ہے۔

پرہ ۱/۸۷۳ پرانہ و آنرا زدالہ نیز گویند و بہندی پرہ نامند صحیح ہندی لفظ پیڑا ہے، مصحح اگر زدالہ کے ہندی متبادل لفظ پر غور فرما لیتے

تو شاید اصلاح ہو جاتی، وہاں بیرہ ہے، اور یہاں پرہ، حالانکہ دونوں میں پیڑا ہونا چاہیئے۔

جنگہ ۲/۱۶۵ جلنگ ملخ آبی را خوانند . . . . . وبہندی جنگہ نامند، ۱/۸۲۰

اربیان ملخ آبی باشد وبہندی جھینگا باشد، گویا اربیان کے ذیل میں جھنگہ (جھینگا) صحیح لفظ ہے، لیکن جنگہ جو جلنگ کے ذیل میں پایا جاتا ہے، وہ غلط ہے، صحیح کلمہ جھینگا ہے۔

جوکت ۲/۱۵۹۲ بلندی چار چوب دررا گویند . . . . . وآنرا بہندی جوکت خوانند، واضح ہو کہ صحیح ہندی لفظ چوکھٹ ہے، بہرحال جیم عربی سے لکھنا کسی حال میں درست نہیں۔

جوہ ۱/۶۱۴ لباد چوبی باشد کہ برگردن گاو نہند . . . . . وآنرا بہندی جوہ خوانند پھر جغ کے ذیل میں مرقوم ہے، (۲/۱۴۲۴)

چوبی باشد کہ برگردن گاو قبلہ کش بہند وآنرا جوہ نیز خوانند۔

دوسری روایت کی بنا پر مصحح نے جوہ کو فارسی لفظ قرار دیا ہے، (دیکھئے فہرست ص ۲۴۲۲ کالم ۲) لیکن یہ صحیح نہیں جوا ہندی لفظ ہے، جیسا کہ لباد کے ذیل میں خود فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے،

چپر ۱/۱۱۶۹ دردوک دو دوکہ خانۂ علف . . . . وآنرا بہندی چپر نامند

چھپر ۲/۲۰۹۰ گومہ خانۂ باشد کہ از کاہ سازند وآنرا چھپر نامند

صحیح لفظ چھپر ہے، چپر کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر چھپر سرے سے غلط ہے، یہ بات اور بھی قابل توجہ ہے کہ ۱/۱۲۹۵ اور ۲/۱۶۹۲ میں دست بند اور تنورہ کے متبادل فارسی لفظ چپر کو ہندی لفظ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

خوب کلاد خوب کلان ۱/۲۹۷ خاکشو وخاکشی . . . . آنرا خوب کلان وشفترک نیز گویند . . . . وبہندی خوب کلا نامند

خرغول غولدہ ۱/۹۶۱ بعربی لسان الحمل وبہندی خوب کلا د خوب کلان نامند

مری زبانگ ۱/۱۱۶۱ وآنرا خوب کلان نیز نامند

واضح رہے کہ صاحب فرہنگ جہانگیری کی رو سے خوب کلاں فارسی اور ہندی دونوں ہے اور خوب کلا محض ہندی ہے، یہ قیاس درست نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ "خ" ہندی میں نہیں ہے، فرہنگ جہانگیری کے مولف کو کچھ سہو ہوا ہے،

دلمل ۱/۱۱۲۶ گرگن غلہ ای بود کہ ہنوز خوب نرسیدہ باشد وآنرا درل ودلمل نیز گویند۔

ہرہ ۱/۱۱۸۴ . . . . . وآنرا کالبنگ وہربنگ نیز نامند وبزبان ہندی خوشہ ودلمل جوار را نامند۔

دراصل خوشہ اور دلمل ہندی لفظ نہیں بلکہ ہرہ (دہرا) ہندی ہے، مصحح کا یہ خیال کہ دلمل ہندی لفظ ہے بے بنیاد ہے۔

دیوک۔ فرہنگ جہانگیری کے چار صفحات ۹۵، ۱۹۶۴، ۲۰۱۳، ۲۲۸۶ کے حوالے سے مصحح نے دیوک کو ہندی لفظ قرار دیا ہے، مگر اصل فرہنگ میں کوئی ادنیٰ اشارہ نہیں جس سے اس کو ہندی لفظ سمجھا جائے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

رائے چنپا ۱/۱۶۱۴ مولف فرہنگ جہانگیری نے اس کو ہندی لفظ لکھا ہے، اور بالکل صحیح لکھا، مگر مصحح کی فہرست (ص ۲۴۶۲) میں اس کے ہندی لفظ ہونے کی صراحت نہیں

رینگھن ۱/۱۵، یہ ہندی لفظ ہنگھن ہے،

سوپ ۲/۱۶۸۶ چم . . . . آنرا پچ وغلہ برافشان نیز گویند وبہندی سوپ گویند، واضح ہو کہ یہ ہندی لفظ سوپ (بائے فارسی سے) ہے جیسا کہ خود فرہنگ جہانگیری

زیر نظر نسخے میں ہے۔ (ص ۲۰۲۳) آیا ہے۔

سوپ بزبان ہندی غلہ برافشان را نامند و آنرا چھاج نیز خوانند۔

سہاکن ۱/۵۲۵ صحیح لفظ سہاگن ہے۔

سہاکہ ۲/۱۷۸۶ صحیح کلمہ سہاگہ ہونا چاہیے۔

کالہ ۱/۶۵۰ کپ اندرون دہن باشد ... و بہندی کالہ نامند اسی فرہنگ کے ص ۱۴۲ اور ۱۸۹۸ میں کالہ ہی درج ہے۔ میرے نزدیک کاف فارسی سے گالہ (= گالا) صحیح ہوگا، اس لئے کہ رخسار کے لیے آج بھی گال کا لفظ ہندوستان میں مستعمل ہوتا ہے۔

کراد کلاد (کلاو) ۱/۱۱۰۲ کرسنہ نام غلہ ایست کہ طعم وی میان ماش و عدس بود و رنگش تیرگی زند ... بہندی کراد کلاد گویند

دراصل کراو اور کلاو صحیح لفظ ہے، آجکل کراو مروج ہے، "رے" کی "لام" میں تبدیلی عام ہے یہی دونوں لفظ اس فرہنگ کے موجودہ نسخے کے ص ۱۳۲۰ (ذیل کیک) اور ص ۱۴۰۶ (ذیل مشنج) میں صحیح صورت میں یعنی کراو، کلاو مندرج ہیں۔

کرکت ۱/۱۳۹ آفتاب پرست و آنرا بتازی حربا و بہندی کرکت گویند

دراصل گرگٹ صحیح ہے، دونوں کاف کاف فارسی اور ت تائے ثقیلہ ہندی ہے

گلی ڈنڈہ - یہ ہندی لفظ چالیک (۱/۲۸۸) اور غوک چوب (۲/۲۰۲۴) کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ گلی ڈنڈا ہے، جو ہندوستانی بچوں کا دلپسند کھیل ہے ڈال اور الف کے نہ لکھنے کا جواز ہے، لیکن کاف فارسی کے حذف سے مسائل الجھ جاتے ہیں،

کیت فہرست ص ۲۵۲۵ میں اشتباہاً ہندی لفظ قرار دیا گیا ہے،

کھات ۱/۷۲، آبخور، ۱/۸۱ آبشخور دونوں کا مترادف قرار دیا گیا ہے، صحیح لفظ گھاٹ ہے، مصحح سے سہو ہوا ہے۔

کھیر۔ ماغ ...... زم را گویند ... بہندی کھیر نامند و آن تیرگی بخاری باشد کہ در ایام زمستان در ہوا پدید گردد

واضح ہے کہ یہ لفظ کہر ہے، کھیر غلط ہے۔

کوکھرو ۱/۱۳۳۱ نسک ...... خار خسک را گویند و آنرا بہندی کوکھرو نامند یہی ہندی متبادل صورت سہ کوہک (۲/۲۱۸۰) کے ذیل میں موجود ہے۔ واضح ہے صحیح لفظ گوکھرو ہے، اور آج بھی مستعمل ہے۔

کیچوہ ۱/۹۴۹ خراطین کرمی باشد دراز ...... و آنرا بتازی خراطین و بہندی کیچوہ خوانند۔

دراصل ہندی لفظ کیچوا ہے، جیم عربی سے غلط ہے، جیم فارسی ہے۔

لوینہ۔ ۱/۸۷۴ پرہن ...... خرفہ را گویند و بہندی لوینہ و کھول نامند

لوینہ غلط ہے لونیا (نون مقدم) صحیح ہے۔

لامی۔ ۱/۹۳۲ چربک ...... سرشیر و آنرا چربہ نیز گویند و بترکی قیماغ و بہندی ملامی واضح ہے کہ یہ لفظ ملائی ہے، اور آج بھی اسی طرح مستعمل ہے۔

اس گزارش سے کسی قدر اندازہ ہوجائے گا کہ اگر فرہنگ جہانگیری کے ناقدانہ متن کی تیاری کے موقع پر متذکرۂ بالا امور کا لحاظ رکھا گیا ہوتا تو وہ متن زیادہ وقیع قرار پاتا، لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فرہنگ جہانگیری کی تصحیح کا کام نہایت مشکل، اور صبر آزما ہے، اور اس سلسلے میں مصحح متن نے جتنی جانکاہی

کی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں، جن کو اس طرح کے کاموں سے سروکار رہتا ہے۔ مصحح کی کوشش اپنی جگہ نہایت قابل تحسین ہے، مقصود صرف اتنا ہے کہ آئندہ اشاعت کے موقع پر ابھی مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ابھی اس میں اضافے کی گنجائش باقی ہے۔

گمان مبر کہ بپایان رسید کار مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

محمود گاواں

بہمنی دور کا ایک عظیم وزیر

از

ڈاکٹر محمد ظفر الہدی سابق استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی

(۲)

(ج) دیوان اس کا دیوان زمانہ کے خورد برد سے محفوظ نہ رہ سکا، اب اس کا سراغ نہیں ملتا، مورخ فرشتہ نے غالباً گیارہویں صدی ہجری کے پہلے سہ ماہی میں اسے دیکھا تھا،[۵۱]

محمود گاواں کی شاعرانہ عظمت دیوان کی غیر موجودگی میں محمود کی شاعرانہ حیثیت کا تعین کرنا آسان نہیں، مورخ فرشتہ[۵۲] نے محض اتنا لکھا ہے کہ نظم و نثر میں اس کا کوئی ہم پلہ نہ تھا، مؤلف برہان آثر نے سید علی طباطبائی کا[۵۳] قول نقل کیا ہے کہ گاواں نے نظم و نثر میں شان و شوکت دکھائی ہے، ان آراء سے محمود گاواں کی شاعری کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، تذکرہ حدائق السلاطین مناظر الانشاء اور ریاض الانشاء میں اس کے کچھ اشعار ملتے ہیں، ان سے بھی اس کی شاعرانہ

---

[۵۱] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۸۔ [۵۲] ایضاً ص ۳۹۸،

[۵۳] برہان آثر صفحہ ۳۳ میں لکھا ہے:۔

"خاطر آفرینش اقسام سخن نظم و نثر داد بلاغت دادہ"

صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے، اس کے خطوط میں لاتعداد اور کثیر حوالے ملتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے عربی اور فارسی کے ممتاز شاعروں کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا تھا، ہزارہا اشعار اس کی نوک زبان پر تھے۔

عربی شاعروں میں وہ امراء القیس، متنبی، ابو تمام، ابو نواس، ابن بابک، ابو البرکات، ابن معشر، ابن سکر، ابن ہجا ہمادی، ابو الطیب، ابو الاسود، ابو العلا معری، صفی صفی الدین حلی کے حوالے دیتا ہے، فارسی شاعروں میں، اسدی، انوری، ظہیر فاریابی، سعدی، حافظ، سلمان ساوجی، خلاق المعانی کمال اسمٰعیل، شرف الدین یزدی، شاہی، خواجو کرمانی، بابا سودائی، ابن حسام، جمال ترکی تبریزی کاتبی، نظیری، اور امیر خسرو وغیرہ کے حوالے وہ اکثر دیتا ہے،

محمود گاواں کے اشعار مرصع، پرجوش، دلگداز اور پردرد ہیں، اس کے خیالات بلند اور جذبات پاکیزہ ہیں، الفاظ کی بندش چست اور محاروں کا استعمال برمحل ہے، فصیح الفاظ اور صنائع و بدائع کا استعمال اس دور کی شاعری کی خصوصیات ہیں، اس دور میں الفاظ پر زیادہ زور صرف کیا جاتا تھا، اس سے شعر کی بے ساختگی مجروح ہو جاتی ہے، اور تصنع جھلکنے لگتا ہے، محمود گاواں بھی اپنے ہم عصروں کی روش سے دامن نہ بچا سکا، لیکن اس کا رجحان فطری شاعری کی طرف تھا، اس لئے اس کے اشعار فطری، غیر مبہم، واضح فصیح اور پرجوش ہیں، فلسفیانہ خیالات، اخلاقی درس، زندگی کے قیمتی تجربات اور نازک و پیچیدہ مسائل بھی اس کے اشعار میں ملتے ہیں، ان چیزوں نے اس کی شاعری کو فطری رنگ عطا کیا ہے، اُس نے بڑے ماہرانہ انداز میں صوفیانہ خیالات سموئے ہیں جس سے اس کی شاعری کا حسن بڑھ گیا ہے، اور اثر میں اضافہ ہو گیا ہے،

اس کی شاعری کے باضابطہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ ریاست کے مسئلوں میں نہ الجھتا اور باضابطہ شاعری کرتا تو بلاشک و شبہ وہ اپنے دور کے بہترین شاعروں میں

گنا جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بے ساختہ اور قلم برداشتہ اشعار کہے ہیں :-

اس کے کچھ منتشر اشعار درج ذیل ہیں،

شستم بہ آب چشمۂ اخلاص ہر دو دست — از لوح جان و صفحۂ دل ہرچہ غیر اوست

گر بے نقاب دیدۂ دل دیدۂ دوست — کافر دلست گر نظرش جز بسوئے دوست

گر می کنی عمارت ایں دل کہ شد خراب — انوار مہر بر دل حیران من بتاب

در امید وصل را دور حیات من صدف — ناوک شست شوق او دل شد طاق جان ہدف

چتر روان و تخت دل بے حجم عشق ہیچ نیست — بے خط داغ عاشقی با دسواد تن تلف

جیب لباس عمر را تا کہ بوسہ کفش — بندم از آنکہ آیدم دامن زندگی بکف

خالص چو گشت نقد رواں ز آتش بلا — باشد بنام عشق تو تا لامکاں رواں

چوں صبا در غنچۂ شکل تو تنگ بوئے آں دہاں — یافت زد بوسہ بکام و بوئے خوش بگرفت ازاں

عشق است در خمیر من و داغ بر دو رخ — پوشیدہ نیست از تو شعار و دثار من

نظرت حرف افزون است ز طاق فلک بروں — کنوز درد و غم کانیست الا در دل محزوں

کسوف عشق تو در قامت دل می دیدم — چو پوشیدہ بہ بالائش نہ کم بود نہ بیش

گر نظر بر من کنی دور م ز تو بے شبہتی — یک جوں ہری کہ باز رات دار دو الفتی

زہرت گشت چوں یاقوت اشکم منعکش در خاک — کہ از عکس جو اسر بہ بود یاقوت شہلانی

از بسکہ اشک و شمنت جملہ جہاں اگر دو تر — در زیر رانت خنگ چرخ افتاں و خیزاں می رود

در جو ئبار عقل چوں بخت شود بلند — از تند باد حادثہ کے میرسد گزند

ہر دعائیکہ شد از بندہ بحضرت مرجع — مستجاب است یقین چون بود از فرط خضوع

کسے بغیر تو چوں رخ کند کہ در ہمہ حال — کسے بغیر تو باشد نزد عقل محال

کبوتر خانۂ روحانیاں را — نقاط و حرف کے دام است ارزن

علم است چوں حیات ابدلے پسر بکوش — وز چشمۂ حیات خود آب حیات نوش

ہمہ عالم نگراں تا نظر بخت بلند — ہر کہ افتد کہ تو یکدم نگرانش باشی

چوں بشنوی سخن من اگر بقبول آری — کلید گنج سعادت در آستیں آری

مگر تو در نصیحت بدرج دل نہ نہی — بسے خوری ز کف دہر سیلی خواری

عظیم صوفی عالم مولانا جامی اس کی شاعری کے بارے میں بلند رائے رکھتے تھے[51]

نظم و نثرش بیں کہ پنداری بچرخ کرد — عقد پروین را در آتش بنات النعش جا

با خود انفاوات محزونات گنج پر گہر — بر بساط عرض بعضے متصل بعضے جدا

فقرہ ہائے نثر او قوت دہ پشت ہنر — نکتہ ہائے نظم او روشن گر طبع ذکا

گاواں کے قصائد

محمود گاواں نے ریاض الانشاء میں اپنے ایک[52] عربی اور تین[53] فارسی قصیدے شامل کئے ہیں، فارسی کا ایک قصیدہ ہمایوں شاہ (۸۶۲ھ تا ۸۶۵ھ / ۱۴۵۸ء) اور دو[54] سلطان محمود شاہ (۸۸۷-۹۲۴ھ / ۱۴۸۲-۱۵۱۸ء) کی مدح میں ہیں جو عربی قصیدہ سلطان محمد شاہ[55] کی مدح میں ہے اور بدیع ہمدانی کے ایک قصیدہ کے اسلوب میں لکھا گیا ہے، عربی قصیدہ سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی ہی کی طرح عربی اشعار بہ آسانی کہہ سکتا تھا،

ایک فارسی قصیدہ جو سلطان محمود شاہ کی مدح میں ہے، اس میں ۸۶[56] اشعار ہیں، اور حکیم حسام الدین انوری کے ایک قصیدہ کے اسلوب میں کہا گیا ہے، انوری کے قصیدہ کا مطلع ہے[57]

[51] کلیات جامی ص ۵۳ اور ۵۴، کلیات میں غلطی سے "طبع" "گنجہ" "تیغ" چھپ گیا ہے،

[52] ریاض الانشاء ص ۱۵۰ تا ۱۵۲، [53] ایضاً ص ۱۴۳ تا ۱۵۰، اور ۳۹۹ تا ۴۰۲

[54] ایضاً ۱۴۳ تا ۱۵۰، [55] ایضاً ۳۹۹ تا ۴۰۲ [56] ایضاً ۱۵۰ تا ۱۵۲

[57] ایضاً ۱۴۳ تا ۱۴۶، [58] قصائد ص ۲۴۰ تا ۲۴۷، اس بحر اور قوافی میں انوری

اے گروہ دردِ عشق تو شکم بخوں بدل — وے ایزدم سرشتۂ ز عشق تو در ازل

گاواں کے قصیدہ کا مطلع ہے،

اے مہر بے زوال تو اے طالع ازل — تا مہر این جنیبہ چہ غم از ظلمت اجل

دوسرے قصیدہ میں ۳۵[59] اشعار ہیں اور خلاق المعانی کمال الدین[60] اسمٰعیل کے ایک قصیدہ کو سامنے رکھکر کہا گیا ہے، جس کا مطلع ہے،

اے در محیط عشقت سرگشتہ نقطۂ دل

وے از جمال رویت خوش گشتہ مرکز دل

گاواں کا مطلع ہے،

شد شکل ضرب تہنیت بر دوش دل حامل — ہیکل ز حرز سیفی وانگہ ہراس لانل

تیسرا قصیدہ جو ہمایوں شاہ کی مدح میں ہے، اس میں ۳۸ اشعار ہیں، یہ قصیدہ کسی دوسرے کے قصیدے کے رنگ میں نہیں ہے، بلکہ آزادانہ لکھا گیا ہے، اس لئے اس میں اور تخلیقیت پائی جاتی ہے، مطلع یہ ہے:

عین عمرم گرز غبار غربت و غم بود تار — شد کنوں روشن ز کحل خاک پای شہریار

(بقیہ حاشیہ ص) کے دو قصیدے ہیں، لیکن گاواں کے مطلع کو پیش نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے، کہ اس کا قصیدہ، انوری کے مذکورہ قصیدہ کے جواب میں ہے نہ کہ اس قصیدہ کے جواب میں جو کہ صفحہ ۲۶۰ تا ۲۶۲ (قصائد انوری) میں درج ہے، اور جس کا مطلع ہے:-

اکنوں کہ مہ دولت خورشید در حمل — باخیر و السلامت و الامن قد نزل

[59] ریاض الانشاء ص ۱۴۶ تا ۱۵۰،

[60] کلیات کمال اسمٰعیل، ۵۷ تا ۵۹،

اس کے قصائد میں تشبیب اور گریز نہیں ہے، قصائد کی ابتدا براہ راست مدح سے ہوئی ہے، فارسی میں قصیدہ گوئی عربی سے آئی ہے، لیکن فارسی قصیدہ گوئی میں اتنی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے کہ اب وہ فارسی ہی کی صنف معلوم ہوتی ہے، فارسی میں اس صنف نے زبان و بیان اور موضوع دونوں ہی لحاظ سے ترقی کی، فارسی میں قصیدہ نگاری ابتدا ہی سے شاعری کی سب سے مشکل صنف سمجھی جاتی ہے، ممتاز شعراء ہی اس میدان میں قدم رکھتے تھے، فارسی کے پرانے قصیدہ نگار انوری، خاقانی، اور کمال الدین اسمٰعیل وغیرہ نزاکت خیال، شدت احساس، تعمق تخیل، شوکت زبان اور بندش الفاظ کے لئے مشہور ہیں، وہ عربی کے فصیح اور بلند آہنگ الفاظ، غیر مروف تلمیحات اور نئی تشبیہات کا استعمال نہایت عمدگی اور آسانی سے کرتے ہیں، محمود گاواں کے سامنے قصیدہ نگاری کے ایسے ہی نمونے تھے. اور قدرتی طور سے اسے انہی کلاسیکی اسلوب کی پیروی کرنی تھی.

محمود گاواں غیر معمولی اوصاف اور علم و فضل کا حامل تھا، قصیدہ نگاری کے لئے شاعرانہ صلاحیت سے زیادہ تبحر علمی کی ضرورت ہے، اور محمود گاواں میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، وہ بلند معیار کے قصیدے لکھ سکتا تھا، اس نے باوقار عالمانہ اور معیاری زبان استعمال کی ہے، بلند آہنگ محاورے، غیر معمولی مبالغہ، دور رس استعارے، اور اعلیٰ تشبیہیں استعمال کی ہیں. علم ہیئت، علوم نجوم، اور دوسرے علم و فن کی اصطلاحات کے استعمال سے اس کے قصیدے میں عالمانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے،

بلا شبہہ محمود گاواں ایک اچھا قصیدہ نگار ہے لیکن وہ انوری اور کمال اسمٰعیل کے درجہ تک نہیں پہنچا، انوری اور کمال اسمٰعیل بے نظیر قصیدہ نگار ہیں، گاواں خود کمال اسمٰعیل کی شاعرانہ افضلیت کا اعتراف کرتا ہے، درج ذیل اشعار میں وہ اپنے آپ کو ایک بڑا عالم،

شاعر، نثر نگار بتاتا ہے، اور "علم و فضل اور دانش" میں کمال اسمٰعیل سے برتر کہتا ہے،

چندیں وزیر کامل بوذند نزد شاہاں　　　لیکن وجود فضلم بر جملہ ہست فاضل

ابن الفرات طبعم در معرض عبارات　　　نہ ابن العمید و صاحب کم نیست در فضائل

از نور آتش طبع و ز چرب ی زبانم　　　مصباح نظم و نثرم روشن کند محافل[51]

گو شد کمال در شعر بے مثل لیک نبود　　　در فضل و علم و دانش ایں بندہ را مماثل

محمود نے انوری اور کمال اسمٰعیل کے اسلوب کو اس طرح برتا ہے کہ ان کے بعد کا مقام اسے حاصل ہو جاتا ہے، شوکت زبان، بلندی خیال اور بندش الفاظ محمود کے یہاں ان دونوں شاعروں کے درجہ کے ہیں،

محمود گاواں اپنے کلام کو پر وقار بنانے کے لئے عربی کے ادق اور مشکل الفاظ استعمال کرتا ہے، کچھ الفاظ یہ ہیں[52] :-

ذابل، کلل، تل، ازھار سنبل، صفرۂ وجل

کبھی کبھی شاعرانہ زبان و بیان کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور وہ ایسے الفاظ استعمال کر جاتا ہے کہ شعر مبہم اور گنجلک ہو جاتا ہے، جیسے :-

---

[51] دوسرے قصیدہ کے مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ ہوں :-

از نکہت گل چمن نظم و نثر من　　　عالم بہشت گشت چہ شد میر دار جبل

[52] شاہا روانہ باشد کا ندر بہار عصرت　　　باشد نہال آمال در باغ عمر ذابل

سلطان محمد آن شہ غازی کہ شاہ چرخ　　　دارد بہ رخ ز ہیبت او صفرۂ وجل

صد عالم جلالت قدرش نجوم چرخ　　　از ہار سنبل است شگفتہ بروے تل

از بہر دفع دشمن پیشہ مثال تو　　　سلطان قدر او کند از نہ فلک کلل

(الف) از ہر دو کون جا نزا مادی دہان اوبس — آرے بہ لامکاں جاں دارد ہمیشہ منزل

(ب) سر قضا بر آرد بیروں ز پردۂ غیب — گر دست قدر فکرش بیروں کند انامل

اس کی کچھ تشبیہیں غیر فطری نامناسب اور قبیح ہیں، جو ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی ہیں،

(الف) سیلاب اشک تو بنشاند بکید م ار — کانون چرخ پر شود از آتش زلل

(ب) ورنہ از ہبِ ست تو بوئے نسیم جود — در بحر از غرق شدی کشتی امل

(ج) از نار اشک نقد ضمیرش بگاہ فکر — در بوتۂ سپہر شدہ نقد نہ حل

مذکورۂ بالا قصائد کے کچھ اشعار نمونۃً درج ذیل ہیں :-

بر شمع داں دل زاں شمع رواں نہادم — تا دیدن رخت را نبود جہات حائل

دل با چراغ عشقت محراب قبلۂ جاں — تن بے خیال رویت خانۂ است جا بائل

زامید روزِ وصلش وز ضرب تیغ ہجرش — نے مردہ ام نہ زندہ چوں مرغ نیم بسمل

جاں در بجائے تن خویش رفتہ بخواب غفلت — آمد ندا کہ برخیز "یا ایّہا المزّمّل"

بفگن کمند مدحت بر قصرِ قدرِ شاہی — کافلاک با کواکب قصرا دست کہ کُل

سلطان محمد آں شہ کز فرط کبریایش — در موقف غلاماں صد سنجر است طغرل

وہم از خیال شکلش بر لوح خاطر آرد — آں چوں شریک باری و خارجست باطل

سر قضا بر آرد بیروں ز پردۂ غیب — گر دست قدر فکرش بیروں کند انامل

پشتش مقوس آمد از بسکہ گشت حامل — بار عطاش جز چرخ طاقت نداشت دائم

بر جود ابر باراں خندد بقہقہہ برق — کز فیض دست شاہست بحر محیط سائل

باد از باں بریدہ گر مرغ شاخ طوبیٰ — اندر ریاض جنت ہست از ثنات غافل

بر تخت ملک دانش نے کس شنیدہ نے دید — شاہے بداو و بنیش ذاتِ تراش کل

قدر تو از بزرگی آں عالمیت کا نرا — آمد سپہر اعظم در قرب استواظل

ہرگز نبود و نہ بود چوں تو شہے و آنگہ — در بندگی و خدمت چوں بندگانِ کامل

حمد ثنائے شہ چوں بر گردن طوق نعمت — از لطف پردۂ عفو بر عیب من فروہل

دریائے شرق و غرب بعین الیقین عقل — اوراق گلشن کرمت را دو قطرہ طل

آن عالمیست قدر تو کز فرط کبریا — افلاک تسعہ است در و کمترین علل

اسی ز سعد اصغر و اکبر شود یقین — گر باید از تو یک نظر تربیت زحل

باہیت اگر گرد جہاں بر کشد خطے — ماند بروں ز دائرۂ کن مکاں اجل

ابتدائے اعتبار عالم از دور تو شد — گر نبودے دور تو عالم کجا و اعتبار

درخور دیوان قدرت نیز اوراق چرخ — کلک دبیر ماہ و محور عقل کل مجموعہ دار

بہر خوان نعمت کانِ تا ابد گسترده باد — حاسد و آہ حسد شد ہمہ پر دود و تار

مطبخت را خیمۂ چرخ ازرق از دود دخاں — محور قطبش عمود و کہکشاں آمد نوار

اشہب قدر ترا نعلے ز میخہائے چرخ — خارج المرکز شدہ بر پشت شیدیت سوار

درزبان دولت وعہد ہمایونت ندید — کس بجز زلفِ بتاں گشتہ بعالم تارتار

گرنسیم خلق تو بر سطح دریا بگذرد — ماہیاں در قعر بحر آیند یکسر مشکبار

عقل و نفس و چرخ و انجم از عناصر تا بتاج — پیشکش شد شاہ قدرت را قطار اندر قطار

از بلندی ہائے قدرت اندر آنجا کہ ہست — چرخ اعظم از غبار پائے قدرت آشکار

ملکداگیری بہ تیغ و دشمناں داری بدار — ایں ہمہ شاہاں سگ کوئے تو باایں گیر و دار

ملتمس مال است از تو دیگراں الیک من — گنج معنی دارم و مالست گرداگرد مار

درشب یادلئے حیرت کاروان فکر را — صد شبہا ہنگست از شوق ضمیرم متعار

قابد و زم ہر قد لطفت قبائے حمد و شکر — طبع تیزم سوزن است و رشتہ عمر است تار

تاکنم صید معانی بہر خوان مدحت

عقل مرکب، فکر صحرا طبع نقادم سوار

ہندستان امیر خسرو کی نظر میں

اس میں امیر خسرو کی مثنویوں اور دواوین سے ان کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق ان کے تاثرات و احساسات کو یکجا کردیا گیا ہے، اور آخر میں انہی سے متعلق ان کی مثنویوں اور دواوین کے اشعار بھی نقل کر دیئے گئے ہیں جن کو پڑھ کر اس عہد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب۔ قیمت :-

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"منیجر"

جمہوریہ جزائر فلپائن

از محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے (علیگ)

جمہوریہ فلپائن جس کے جنوبی حصہ میں مسلمان اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کرنے کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں، مختلف حیثیتوں سے جنوب مشرقی ایشیا کا ایک اہم ملک ہے، اس کے شمال و مغرب میں بحر چین، مشرق میں بحر الکاہل اور جنوب میں بحر سلیبس واقع ہے، یہ دراصل سات ہزار ایک سو سات چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل مجمع الجزائر ہے، ان میں بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل ہیں، جو ابھی انسانی قدموں کے منتظر ہیں، اس مجمع الجزائر کا خشکی کا رقبہ مجموعی طور پر تین لاکھ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ تمام جزیرے خط استوا کے نزدیک اس کے شمال میں واقع ہیں۔ اور فارموسا سے لے کر بورنیو تک ان کا سلسلہ چلا گیا ہے، یہاں آتش فشاں پہاڑوں کی بڑی کثرت ہے۔ خوفناک زلزلوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے، اس کے فلپائن کہلائے جانے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ فرمانروائے اسپین فلپ ثانی کے عہد یعنی سنہ ۱۵۶۵ء میں اسکی دریافت ہوئی تھی، چنانچہ یہ ملک اسکی طرف منسوب ہوگیا۔

جزائر فلپائن کی مجموعی آبادی حالیہ مردم شماری کے مطابق چار کروڑ دس لاکھ ہے، اسکا قومی پرچم نیلے اور سرخ دو افقی رنگوں پر مشتمل ہے، جس کے درمیان میں آٹھ شعاعوں کا ایک سنہرا سورج اور تین ستارے بنے ہوئے ہیں۔ فلپائن کا صدر مقام پہلے منیلا تھا، مگر

اب کچھ عرصہ سے کوئزن سٹی دار السلطنت ہوگیا ہے، اس کے چند اہم بڑے بڑے جزیروں کے نام اور ان کا رقبہ حسب ذیل ہے۔

لوزان (۴۱۸۳۵ مربع میل) منڈاناؤ (۳۶۳۸۱ مربع میل) سمار (۵۱۸۴ مربع میل) پالوان (۵،۷۵۱ مربع میل) منڈورو (۳۹۹۵ مربع میل) سیبو (۱۹۶۴ مربع میل) لائٹے (۳۰۹۰ مربع میل) پانے (۴،۴۲۹ مربع میل) بوہول (۱۵۸۹ مربع میل) ماسبیٹ (۱۵۶۲ مربع میل)

فلپائن کے مشہور صنعتی مرکز اور قدیم پایہ تخت منیلا کی آبادی ۱۳ لاکھ ۶۵ ہزار اور جدید دار الحکومت کوئزن سٹی کی ۴ لاکھ ۵ ہزار ہے۔

جزائر فلپائن نے ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک جمہوریہ کی حیثیت حاصل کی اس کے آئین میں برابر ترمیمات ہوتی رہیں، بالآخر ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک نیا آئین مرتب ہوا جو تا حال نافذ ہے، اسکی رو سے صدر مارکوس غیر معینہ مدت کے لیے ملک کے عہدۂ صدارت اور وزارت عظمیٰ دونوں پر بیک وقت فائز ہوئے، حکومت کا نظام چلانے کے لیے درج ذیل تیرہ[۱۳] شعبہ جاتی سکریٹری صدر کی مدد کرتے ہیں۔

امور خارجہ[۱]، مالیات[۲]، قانون[۳]، دفاع[۴]، صحت[۵]، تعلیم[۶]، مواصلات[۷]، محنت[۸]، صنعت[۹]، تجارت[۱۰]، زراعت[۱۱]، عام خدمات[۱۲]، سماجی بہبود[۱۳]،

مجلس نمائندگان ۲۴ ممبران کی سینیٹ اور ۱۲۰ ارکان کے ہاؤس پر مشتمل ہے۔ ۲۱ سال کے تمام مردوں اور عورتوں کو جو انگریزی، اسپینی، یا کوئی اور قومی زبان لکھ پڑھ سکتے ہیں، ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، انتظامی طور پر پورا فلپائن ۶۸ صوبوں، ۶۱ منظور شدہ شہروں، ۱۴۳۳ میونسپلٹیوں میں منقسم ہے، ہر صوبہ اپنی انتظامیہ خود منتخب کرتا ہے۔

فلپائن کی قومی زبان ٹیگالاگ کہلاتی ہے، لیکن سرکاری دفاتر اور پرائیوٹ اداروں میں انگریزی اور اسپینی زبان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ فلپائن میں ۸۰ مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، جن میں نو بہت اہمیت کی حامل ہیں، یوں تو یہاں کئی مذہب پائے جاتے ہیں، لیکن اصلاً عیسائیوں کے مختلف فرقے اور مسلمان ہی قابل ذکر ہیں، یہاں مسلمانوں کو مورو کہا جاتا ہے، جن کی موجودہ تعداد پچاس لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہ بیشتر ملک کے جنوبی حصے میں آباد ہیں۔

یہاں ساٹھ فی صد عوام خواندہ ہیں، پرائمری سطح تک تعلیم مفت ہے، عجیب بات ہے کہ سرکاری طور پر ٹیگالاگ کو قومی زبان قرار دیئے جانے کے باوجود تمام اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، حتی کہ فلپائنی زبان کو بھی انگریزی ہی کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے، اور فلپائینیوں کی اکثریت انگریزی ہی بولتی بھی ہے، اسپینی زبان کی تعلیم ثانوی اسکولوں میں لازمی اور کالجوں میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ پورے ملک میں ۴ لاکھ پچپن ہزار ثانوی اسکول اور ۹ ہزار کالج ہیں اس کے علاوہ منیلا میں ۱۹۰۸ء سے ایک یونیورسٹی بھی قائم ہے۔

فلپائن کے سرکاری سکہ کا نام "پیسو" ہے، جو ۲۰۰ امریکی سینٹ کے مساوی ہوتا ہے، اس کے علاوہ نصف پیسو، ربع پیسو، اور پیسٹا کے سکے بھی رائج ہیں، یہ تمام سکے خالص چاندی کے ہوتے ہیں، چنانچہ ایک پیسو بیس گرام چاندی پر مشتمل ہوتا ہے،

مجمع الجزائر فلپائن میں جنگلوں کی بڑی کثرت ہے، اس سے عمارتی لکڑی، لٹھے، گوند، سبزیوں کا تیل، بانس، شاہ بلوط، رنگنے کی چھال اور رنگائی کا مسالہ بڑی کثرت سے حاصل ہوتا ہے، فلپائن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ زراعت ہے، ایک کروڑ ساڑھے چار لاکھ

ہیکٹر زمین پر کاشت کی جاتی ہے، چاول، گنا، مکئی، سن، گری اور تمباکو اپنی کثرت پیداوار کے لیے قابل ذکر ہیں یہاں پھلوں میووں، مختلف سبزیوں، کافی، ربر اور روئی کی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔

فلپائن میں معدنیات بھی اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ دنیا کے کسی دوسرے خطہ میں شاید ہی اس کی نظیر مل سکے۔ پورا مجمع الجزائر لوہے، سیسہ، تانبہ، سونا، چاندی، نمک، کوئلہ، سیماب، کھریا مٹی، اور کرومیٹ کی دولت اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ سامان ہر سال لاکھوں ٹن کی مقدار میں بیرونی ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے، یہاں کی شکر اپنی لطافت، صفائی اور عمدگی کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے،

یہاں کی برآمدات میں لٹھے اور عمارتی لکڑی، تانبہ، گری، ناریل کا تیل، خربت اناس پلائی ووڈ اور شکر قابل ذکر ہیں، ملکی معیشت کا اصل دارومدار ان اشیاء کی برآمدات اور اسکے کثیر زر مبادلہ ہی پر ہے،، اسی طرح یہاں کی درآمدات میں مشینیں، کپڑے، ایندھن، ذرائع نقل وحمل کا سامان، معمولی دھاتیں اور کیمیکل اشیاء شامل ہیں۔ فلپائن اپنے حدود اربعہ کے اعتبار سے چونکہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے مچھلیوں کو یہاں کی اقتصادیات اور معیشت میں کلیدی اہمیت حاصل ہے، ہر سال اربوں ٹن مچھلی بیرونی ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے، چاول اور مچھلی یہاں کے باشندوں کی محبوب ترین غذا ہے۔

جزائر فلپائن میں گھریلو صنعت کا عام رواج ہے، خاص طور پر زردوزی سے بنے ہوئے کپڑے، چٹائیاں، مٹی کے برتن اور جالیدار ہیٹ وغیرہ بنانے کا کام بہت وسیع پیمانے پر گھروں کے اندر ہوتا ہے۔ بایں ہمہ یہاں کارخانوں کی بھی کمی نہیں ہے، ایک سروے کے مطابق فلپائن میں ناریل کے تیل کی ۲، ملیں، سگار، اور سگریٹ کی ایک سو دو (۱۰۲) فیکٹریاں،

آٹھ ہزار تین سو چاول ملیں، نو سو اٹھائیس جوتا بنانے کے کارخانے، ۲۵ شکر اور ۴ سمنٹ کی ملیں قائم ہیں۔

فلپائن کی مسلح افواج کی تعداد دو لاکھ ہے، جس میں بری فوج تقریباً ایک لاکھ بحری فوج تیس ہزار، اور ہوائی فوج ستر ہزار جوانوں اور افسروں پر مشتمل ہے فضائیہ اور بحریہ جدید ترین آلات حرب سے لیس ہیں۔ ۱۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو فلپائن اور امریکہ کے درمیان ایک ۹۹ سالہ فوجی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے، اس کی رو سے امریکہ نے فلپائن کو زمینی ہوائی اور بحری افواج کے لیے بہت سے حربی ساز وسامان کی سپلائی منظور کی تھی اسی سال ۲۱ مارچ کو ایک دوسرا معاہدہ ہوا، جس کے مطابق فوجی مشاورتی گروپ اور فوجی معاونین امریکہ سے یہاں آئے، ۳۰ اگست ۱۹۵۱ء کو واشنگٹن میں ایک باہمی تعاون کے معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ جس کی توثیق شدہ دستاویزوں کا تبادلہ منیلا میں، ۲۷ اگست ۱۹۵۲ء کو ہوا،

فلپائن جنوب مشرقی ایشیا کے مشترک دفاع کے معاہدہ پر دستخط کرنے والے ملکوں میں بھی شامل ہے،

فلپائن کی اجمالی تاریخ

جزائر فلپائن کی تاریخ پانچ سو سال سے زیادہ قدیم ہے، اسکی دریافت کا سہرا میگلن نامی ایک اسپینی کے سر ہے۔ جس نے اپنی سمندری سیاحت کے دوران مارچ ۱۵۲۱ء میں سب سے پہلے جزیرہ ملہو کا انکشاف کیا، پھر میگلن ہی نے اسکے بعد شمال و جنوب میں منڈاناؤ، بوہول، سیبو اور میکتن کے جزیرے دریافت کیے۔ اس نے اپنی اس دریافت کو مجمع الجزائر سان لیزرس کے نام سے موسوم کیا، لیکن اسپینیوں نے اسکو مغربی جزائر کا نام دیا، پرتگالی، انکو مشرقی جزائر کہا کرتے تھے کیونکہ ان کیلئے یہ جزیرے مشرقی سرحد کا کام کرتے تھے،

۱۵۴۲ء میں روئی لوپز دی ولاباس (۱۵۰۰ء — ۱۵۴۴ء) نے جزائر فلپائن کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ ولاباس نے کچھ جزیرے میگلن کے دریافت کردہ جزائر کے شمال مغرب میں مزید دریافت کئے، اور انھیں اسپین کے ولی عہد شہزادے سے منسوب کرتے ہوئے "جزائر فلپیناز" کے نام سے موسوم کیا۔ فلپ ثانی کی تخت نشینی (۱۵۵۵ء - ۱۵۵۸ء) کے بعد ممتاز فاتح مائیگل لگاسپی (۱۵۲۲ء — ۱۵۷۲ء) کی سربراہی میں، ایک مہم ساحل میکسیکن پر چلائی گئی۔ اس مہم کے بارے میں ۱۵۶۴ء میں جو ہدایات جاری کی گئی تھیں ان میں جزائر فلپیناز سے مکمل مجمع الجزائر مراد لیا گیا تھا۔

لگاسپی نے ۱۵۶۵ء میں جزیرہ سیبو میں سان مائیگل نامی ایک بستی آباد کی، جو ان جزائر میں پہلی باضابطہ اسپینی بستی تھی، یہی بستی آگے چل کر ولادی جیسس کہلائی۔ اور پھر بعد میں اسی کو شہر سیبو کا نام دیا گیا، ۱۵۷۱ء میں منیلا کی بنیاد پڑی، اور وہ اسپینیوں کا مستقل دار السلطنت قرار پایا۔

۱۷۶۲ء میں اسپین اور برطانیہ کے درمیان جنگ کے باعث ۱۳ جہازوں کا ایک برطانوی بیڑہ، امیر البحر سیموئل کارنش اور بریگیڈیر جنرل ولیم ڈریپر کی قیادت میں فلپائن بھیجا گیا، وہاں تقریباً چھ سو اسپینی سپاہی موجود تھے، حملہ آوروں کی تعداد کم و بیش ۲ ہزار آٹھ سو تیس تھی، شدید حملوں کے بعد منیلا پر برطانویوں کا قبضہ ہوگیا، اور ایک صلح نامہ کے مطابق مکمل مجمع الجزائر برطانیہ کے زیر تسلط آگیا، اور اسپینیوں کو نقصانات کے معاوضہ کے طور پر چالیس لاکھ پیسو ادا کر دیا گیا، لیکن پھر کچھ عرصہ بعد حالات میں انقلاب آیا اور ۱۷۶۴ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد جزائر فلپائن پر اسپین کا دوبارہ قبضہ ہوگیا، اور منیلا برطانوی شہریوں سے خالی کرالیا گیا۔

اس کے بعد سے یہ جزائر برابر اسپین کے زیر نگین رہے۔ لیکن وہاں کے سیاسی حالات کبھی پرسکون نہیں رہے، خاص طور سے ۱۸۲۵ء سے ۱۸۹۶ء تک کا زمانہ تو شدید ترین خلفشار اور بے چینی کا دور تھا، بکثرت اخبارات کے اجراء، تجارت کی وسعت بیرونی ملکوں سے رسائل و کتب کی آمد سے مقامی باشندوں کے اندر بغاوت کے جراثیم سرایت کرنے لگے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ سہولیات سفر کے باعث یہاں کے باشندے یورپ جانے اور وہاں سے جدید افکار و خیالات لے کر واپس آنے لگے، اسطرح اسپینی حکمرانوں کی آمریت اور معاشی استحصال کے خلاف اہل فلپائن کی جد وجہد شروع ہوگئی، ۱۸۹۶ء میں جب حکومت نے تین سو فلپائنی باشندوں کو جیل میں ڈال دیا تو بغاوت کا لاوا ابل پڑا، اور اسپینی افواج اور فلپائنی باغیوں کے درمیان جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، باغیوں کا سرخیل اگنالڈو تھا، اسپینی افواج جنرل بلانکو کی سربراہی میں مدتوں مورچے سنبھالے رہیں، لیکن حالات کسی طرح قابو میں نہیں آرہے تھے،

حکومت اسپین نے فلپائن میں بغاوت کو کچلنے کے لئے یکے بعد دیگرے اپنے گورنروں اور فوجی کمانڈروں میں تبدیلی کی۔ یہاں تک کہ جنرل پرائمو کا تقرر عمل میں آیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ حریت پسندوں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھاتا، کیوبا میں حالات اتنے دگرگوں ہوگئے کہ اسپینی حکومت نے جنرل پرائمو کو بذریعہ تار باغیوں سے فوراً صلح کر لینے کا حکم دیا، جس کے نتیجہ میں حریت پسندوں کے خلاف تمام فوجی کاروائیاں منسوخ کر دی گئیں، اور ۱۴ دسمبر ۱۸۹۷ء کو معاہدہ "بیاکابیٹو" عمل میں آیا، اس کی رو سے فلپائنی قائد بغاوت اگنالڈو اور اس کے ۳۵ رفقاء کو چار لاکھ پیسو کے ساتھ ہانگ کانگ جانے کی اجازت دیدی گئی، لیکن حکومت اسپین نے اس صلح کی شرائط کو تسلیم کرنے سے

انکار کر دیا، اور منیلا میں صلح کی تقریبات مسرت کے فوراً ہی بعد ان تمام لوگوں کے قتل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، جن کا تحریک حریت سے کوئی بھی تعلق تھا۔

فلپائن کے لیے اسپین اور امریکہ کے درمیان جنگ اور امریکہ کا قبضہ

۱۵ فروری ۱۸۹۸ء کو بندرگاہ ہوانا میں امریکی جہاز بارود سے اڑا دیا گیا، ۱۵ مارچ کو فلپائنی گورنر جنرل پرائمو کو معلوم ہوا کہ امریکی نائب امیر البحر جارج ڈیوے ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر اپنی بحری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے، لہذا اس نے صورت حال پر غور کرنے کے لیے ایک مشاورتی میٹنگ طلب کی جس میں اسپینی امیر البحر مونٹو جو نے نہایت صفائی کے ساتھ بتایا کہ جنگ کی صورت میں فلپائن کے بحری بیڑے کا تباہ ہو جانا یقینی ہے، اس نازک صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت اسپین نے فلپائن سے جنرل پرائمو کو واپس بلا کر جنرل آگسٹی کو اس کا جانشین مقرر کیا، لیکن قبل اس کے کہ نیا گورنر جنرل حالات کا جائزہ لے کر مناسب حفاظتی اقدامات کرتا ہانگ کانگ سے یہ اطلاع آئی کہ جارج ڈیوے منیلا کے لیے روانہ ہو چکا ہے، لہذا فلپائنی امیر البحر مونٹو جو بعجلت تمام خلیج سوبیگ (Subig) ہوتا ہوا صوبہ کیویتے پہونچا، اور اسپینی بیڑے کو یا تو مکمل طور پر تباہ کر دیا یا کم از کم ناکارہ بنا دیا، تاہم اسپینی حکومت نے ہتیار ڈالنے سے انکار کر دیا، لہذا امریکیوں نے کیویتے پر قبضہ کر لیا۔

خلیج منیلا کی جنگ اور اسپینی جہازوں کی تباہی نے پورے مجمع الجزائر فلپائن میں اسپینی وقار کو سخت دھکا پہونچایا، اور پھر تقریباً ہر صوبہ میں بغاوت کی خوفناک لہر شروع ہو گئی۔ امریکہ نے جس کی حکومت ابھی تک صرف صوبہ کیویتے تک محدود تھی اپنے اقتدار کو مزید وسیع و مستحکم کرنے کے لیے مقامی باشندوں کی اس بغاوت سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی، چنانچہ اس نے اگنالڈو کو اپنے رفقا کے ساتھ ایک امریکن جہاز میں

کیویتے آنے کی اجازت دیدی، اگنالڈو نے فلپائن واپس آکر اسپینیوں کے خلاف اپنی تحریک اتنے زور شور سے چلائی کہ اس کی آندھی میں اسپینی اقتدار پر کاہ کی طرح اڑ گیا، یہاں تک کہ سوائے شہر منیلا کے تقریباً لوزان کے پورے جزیرے پر اس نے قبضہ کر لیا اور ۱۳ اگست کو جنرل ویسلی میرٹ کی سرکردگی میں منیلا بھی امریکیوں کے ہاتھ میں آگیا،

لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جب اگنالڈو کی مدد سے امریکیوں نے فلپائن سے اسپینی اقتدار کا خاتمہ کیا تھا۔ مقصد برآری کے بعد منیلا میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کیونکہ امریکیوں کو اس کی حریت پسندی سے خود اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، اگنالڈو نے اس بدعہدی اور جفا شعاری کے باعث فلپائن کے مقامی باشندوں کے ساتھ مل کر امریکیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور گوریلا طرز کی جھڑپیں حریت پسندوں اور امریکیوں کے درمیان برابر ہوتی رہیں، جن کو امریکہ نے نہایت سختی کے ساتھ کچل دیا۔ بالآخر ۱۰ دسمبر ۱۸۹۸ء کو پورے مجمع الجزائر فلپائن پر امریکی پرچم لہرانے لگا۔

جولائی ۱۹۰۱ء میں وہاں فوجی راج ختم کر کے سول حکومت قائم کی گئی، اور صدر روزولٹ نے غیر فوجی حکومت اور قانون ساز اداروں کے قیام کے ایکٹ پر دستخط کر دیئے، ۱۹۰۷ء تک فلپائن میں برابر امریکی گورنر جنرل مامور ہوتے رہے، ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء کو فلپائن اسمبلی کے پہلے انتخابات ہوئے، جس میں اسنیشنلسٹ فور م، ۱۶ ترقی پسند گروپ اور ۳۳ آزاد امیدوار منتخب قرار دیئے گئے۔ نیشنلسٹ امیدواروں نے انتخابات سے قبل عوام سے وعدہ کیا تھا، کہ اگر وہ اسمبلی کے لیے منتخب ہو گئے تو ملک بہت جلد آزاد ہو جائے گا، لیکن اسمبلی کے پہلے ہی

اجلاس میں یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ ان منتخب امیدواروں کی اکثریت انتخابات سے پہلے کے اعلانات اور وعدوں پر ثابت قدم رہنے کے بجائے قانون ساز ادارہ پر اکتفا زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن بایں ہمہ آزادی کی جدوجہد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، آخر کار ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو فلپائن کا نیا آئین مرتب ہوا۔

۴۰ء اور ۴۶ء میں اس میں مزید ترمیم کی گئی، اس کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو یہ آئین منسوخ کر کے ایک نیا آئین مرتب کیا گیا، جو اس وقت تک نافذ ہے۔

(باقی)

وفیات

پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی

از سید صباح الدین عبد الرحمن

گذشتہ مئی میں ملک کے مشہور ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کی وفات سے ایک عظیم علمی سانحہ ہوا، بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد ان ہی کی علمی شخصیت اُبھری، انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ رہ کر نہ صرف تربیت پائی، بلکہ ان کی شانتی نکیتن یونیورسٹی کی تاسیس میں اُن کا بھی حصہ تھا، بنگال کے اس فلسفی شاعر نے اُن کی جوانی ہی میں اُن کی قدر کرنی شروع کر دی تھی، اور اپنی ایک کتاب اُن کے نام سے معنون بھی کیا، اور ان کو بھاشا اچاریہ کا خطاب دیا، جس کے معنی زبانوں کا پیشوا ہے، اس خطاب کے وہ مستحق تھے، وہ بنگالی، سنسکرت، ہندی، پراکرت، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، آئرش، گوتھک اور خدا جانے کتنی زبانیں جانتے تھے،

کلکتہ اور لندن سے ڈگریاں حاصل کر کے کلکتہ یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے، یہاں رہ کر انھوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیئے، ان پر یونیورسٹی ہمیشہ ناز کرتی رہیگی، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کوئی علمی اعزاز ایسا نہ تھا جس سے وہ سرفراز نہیں کیئے گئے، رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ ملایا، سماترا، جاوا، بالی اور تھائی لینڈ گئے، تو وہاں ہندوستانی آرٹ اور کلچر پر اُن کے لکچر بہت مقبول ہوئے، جس کے بعد علم و زبان کی تمام بین الاقوامی کانفرنسوں میں مدعو ہونے لگے، اسی سلسلہ میں بلجیم اور کوپن ہیگن کا سفر کیا، یونسکو کے علمی اجتماعات

میں شرکت کے لئے کئی بار پیرس بلائے گئے، بیروت میں عربی و فارسی کی علمی ولسانی کانفرنس ہوئی تو وہاں خاص طور پر مدعو ہوئے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ اور ترکی کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجے گئے، پن سلونیا یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی مقرر ہوئے، امریکہ کے قیام میں کولمبیا اور ییل کی یونیورسٹیوں اور واشنگٹن کی علمی مجلسوں میں لکچر دیئے، راک فیلر فونڈیشن کی طرف سے میکسیکو کے مختلف شہروں میں خاص خاص موضوعات پر لکچر دینے کے لئے بھیجے گئے، پیکنگ یونیورسٹی اور چینی حکومت کی دعوت پر چین بھی گئے، روس کی سوویٹ اکیڈمی آف سائنس نے ان کو روس مدعو کیا، جہاں کے مختلف شہروں میں اُن کے لکچر ہوئے، یونسکو کی طرف سے مشیگن یونیورسٹی میں بھی لکچر دیئے، پھر منگولیا جاکر وہاں اپنی علمی عظمت کا سکہ جمایا، کینبرا میں دولت مشترکہ کی پارلیمنٹری کانفرنس ہوئی تو اس میں ہندوستان کی نمائندگی کی، جاپان بھی گئے، جہاں ٹوکیو یونیورسٹی میں لکچر دیئے، وہاں سے فلپائن گئے، جہاں منیلا یونیورسٹی ...... کو مخاطب کیا، وہ لیتھونیا اور لیٹ ویا بھی مدعو ہوئے، ہندوستان کی طرف سے افریقہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں ہندوستان کی تاریخ اور کلچر پر لکچر دینے کے لئے بھیجے گئے، حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ماتحت محکمۂ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کی طرف سے گھانا، نائجیریا اور لائبیریا کی یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لئے مامور ہوئے، قاہرہ، ادیس بابا، طہران، بخارسٹ اور روم جاکر بھی لکچر دیئے، فرانس کی دو یونیورسٹیوں کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تو وہاں بھی بلائے گئے، آرمینیا اور ہندوستان کے ثقافتی تعلقات پر مواد جمع کرنے کے لئے آرمینیا بھی بھیجے گئے، زیکوسلویکیا کی ایک یونیورسٹی کے چھ سو سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر مدعو ہوئے تو وہاں اُن کی قابلیت کا اعتراف ایک طلائی تمغہ دے کر کیا گیا، روم کی یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی، دنیا میں لسانیات کی جو بھی کانفرنس یا مجلس کہیں ہوئی، چاہے یہ پولینڈ یا ہوائی یا نیویارک یا پیرس یا ناروے یا سری لنکا میں ہوئی

اس میں وہ ضرور بلائے جاتے، وہاں وہ پہنچ کر بڑا اچھا اثر پیدا کرتے جس سے ہندوستان کے علمی وقار میں اضافہ ہوتا رہتا،

اس بین الاقوامی علمی سفیر وضمیر کی قدر ملک کے اندر بھی اُن کے رُتبہ کے مطابق ہوتی رہی، برما بنگالی لٹریری کانفرنس، بنگال لٹریری کانفرنس، آل انڈیا اورنٹیل کانگریس اور آل انڈیا ہندی لٹریری کانفرنس وغیرہ کے اجلاسوں کی صدارت کی، ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے بعد دہلی کی ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہوئے، انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے بہت ہی اہم اور ممتاز رکن رہے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اُن کو ہر قسم کا اعزاز ملا، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے مستقل اعزازی رکن تھے، اور اس کی ساری علمی سرگرمیوں سے برابر دلچسپی لیتے رہتے، بنگال لیجسلیٹیو کانسل کے پہلے رکن اور پھر اس کے صدر بھی ہوئے، ان غیر معمولی ملکی اور غیر ملکی علمی سرگرمیوں کے باوجود تصنیف و تالیف کے مشاغل بھی برابر جاری رکھے، بکثرت مضامین لکھنے کے ساتھ حسب ذیل کتابوں کے مصنف بھی ہوئے،

(۱) اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لینگویج (۲) انڈیا اینڈ ایتھوپیا (۳) ورلڈ لٹریچر اینڈ ٹیگور (۴) ایرانیزم (۵) جے دیو (۶) انڈیا لے پولی گلوٹ نیشن (۷) اے شورٹ اینڈ ارینہ ہند وویڈنگ اینڈ اینی شی ایشن ری چو ئلز (۸) بنگلہ بھاشا پر سنگے وغیرہ، حکومت ہند نے ان کو پدم بھوشن اور پدم وبھوشن کے خطابات دے کر اُن کی علمی خدمات کو سراہا،

اُن کی ہر قسم کی قدردانیوں کے باوجود اُن کی بعض تحریریں متنازعہ فیہ بن گئی تھیں، ان پر نکتہ چینی ہوئی کہ انھوں نے رامائن کے قصے کو ہومر سے مستعار بتایا ہے، انکی طرف سے یہ جواب تھا کہ انھوں نے رامائن کو تو نہیں لیکن اُن کے نزدیک دس سروں والے راکشس کا وجود یونانی تخیل کی صدائے بازگشت ہے، کیونکہ ہندوؤں کے قدیم ترین خرافاتی ادب میں ایسے راکشس کا

ذکر نہیں ملتا، انھوں نے بعض بہت ہی پرانے شواہد سے اس پر بھی بحث کی ہے، کہ رام اور سیتا، بھائی بہن تھے، یا ازدواجی رشتے میں منسلک تھے، اس سے بھی ایک علمی سنسنی پھیلی،

اُن سے میری ذاتی ملاقاتیں بھی رہیں، وہ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، میں بھی ہمیں دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی نمایندگی بارہ[12] برس تک کی، اس کے جلسوں میں ان کی اہم تقریریں ہوتیں، جو شوق سے سنی جاتیں، جلسہ ختم ہوتا تو اراکین ان کو گھیر لیتے، میں بھی ان سے ملتا رہتا، وہ دار المصنفین کی علمی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے البیرونی پر ایک اہم یادگار جلد شائع ہوئی تھی، اس میں ان کا ایک مضمون "البیرونی اینڈ سنسکرت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، میں نے اس سے اپنی تصانیف اور مضامین میں بڑا استفادہ کیا تھا، ان سے اس مضمون پر دیر تک باتیں ہوئیں، میں نے کانسل کے ایک اجلاس میں اپنی ایک تقریر میں دار المصنفین کی مطبوعات میں سے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" کا ذکر کیا، تو ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس کتاب سے بڑی دلچسپی لی، اور اس کی جلدوں کی وی، پی، بھیجنے کو کہا، اعظم گڈھ آکر میں نے اس کی ایک جلد اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیجدی، جب یہ اُن کے پاس پہنچی تو انھوں نے مجھ کو انگریزی میں یہ خط لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے،

"جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب!

آپ کا خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو موصول ہوا، اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، اس خط کے ساتھ میرے لئے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ایک بہت ہی دل پذیر تحفہ ہے،

آپ لوگوں کا یہ خیال بہت ہی خوب رہا کہ ایک علمبردار اسلام کے ان تیرہ مصنفوں کی تحریروں کے اقتباسات جمع کر دیں جنھوں نے عربی زبان میں ہندوستان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار

کیا ہے، اس کتاب میں عربی عبارتوں کے ساتھ جو ان کے اردو ترجمے دیئے گئے ہیں، اس سے غیر معمولی سہولت پیدا ہو گئی ہے، عرب مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریر میں بعض ملکوں کے قدیم عہد اور ازمنۂ وسطیٰ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت ہی قیمتی ماخذ ہیں، یہ ملک خواہ ایشیا یا یورپ یا افریقہ ہی کے کیوں نہ ہوں، مغربی افریقہ کے چار یا پانچ سو بلکہ ایک ہزار برس پہلے کے حالات جاننے کے لئے تو ان عرب مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریریں ہی واحد ماخذ بنی ہوئی ہیں، شبلی اکیڈمی نے یہ کتاب (ہندوستان عربوں کی نظر میں) شائع کر کے ہندوستان سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب تو ایسی ہے کہ ریسرچ کرنے والوں کو اپنی الماری میں رکھنی چاہئے، جو پڑھا لکھا آدمی ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ اور کلچر سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کے پاس بھی یہ کتاب ہونی چاہئے، والسلام

آپ کا مخلص

سنیتی کمار چٹرجی

وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، ایک دن سب ہی کو یہاں سے کوچ کرنا ہے، مگر ان لوگوں میں ہیں، جو اپنے پیچھے اپنا شاندار نام اور کام چھوڑ جاتے ہیں، ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی، تو اُن کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا، بنگال کی جس کلچر گیلری میں بنکم چندر، جے سی، بوس، اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں ہوں گی، وہاں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا بھی ہونا ضروری ہے،

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر سلامؔ سندیلوی شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

اُس دل پہ میری آہ و فغاں کا اثر نہیں — کیسا ہے یہ چمن کہ صبا کا گذر نہیں

بیکار جستجو میں بھی اک لطفِ خاص ہے — دیکھوں گا میں اُدھر وہ خراماں جدھر نہیں

آنکھوں کے واسطے نہیں لازم کہ نور ہو — نرگس بھی چشم رکھتی ہے لیکن نظر نہیں

اک تیرا روئے ناز ہے اک میرا داغِ دل — میں خوب جانتا ہوں یہ شمس و قمر نہیں

کتنی کرشمہ ساز ہے یہ مشقِ ضبط بھی — محسوس ہو رہا ہے کہ دردِ جگر نہیں

اسرارِ آسماں کا سمجھنا محال ہے — ظلمت ہے جس طرف مہ و انجم ادھر نہیں

جنبش زمینِ دل کو ہوئی کچھ نہ کچھ ضرور — کب آئے، کب چلے گئے اتنی خبر نہیں

مشکل ہے کوئی اس کی ادا کو سمجھ سکے — وہ جلوہ گر ہے یوں کہ کہیں جلوہ گر بھی

شام و سحر کا ساتھ رہا ہے مگر سلامؔ — اک شام ایسی آئے گی جس کی سحر نہیں

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

یہ معجزہ ہے عشق کا وہم و گماں سے دور — میں تیرے دل کے پاس ہوں چشمِ جہاں سے دور

صحنِ چمن میں آج یہ کیا دیکھتا ہوں میں — کچھ بال و پر ہیں بکھرے ہوئے آشیاں سے دور

سجدوں میں اب وہ کیفِ حضوری نہیں نصیب — کیا لطفِ بندگی کا ترے آستاں سے دور

کچھ اس ادا سے راہِ طلب میں ہوں گامزن — ہر کارواں کے ساتھ ہوں ہر کارواں سے دور

آخر کوئی حساب ہے ان کا بھی اے کریم — جو سجدے کر چکا ہوں ترے آستاں سے دور

جوہرؔ نہ پوچھ عظمتِ رفتہ کی داستاں — تابندہ اک ستارہ ہوں اور آسماں سے دور

غزل

از جناب محمد شرف الدین ساحلؔ ناگپور

کسی چہرے پہ مسرت کا یہاں نور نہیں — کیسی محفل ہے تری کوئی بھی مسرور نہیں

ذرہ ذرہ ہے مرے واسطے برقِ سرِ طور — طور تک ہو جو کلیمی مجھے منظور نہیں

انتہا دیکھ ذرا اپنے کرم کی اے دوست — کون ایسا ہے جو فریاد پہ مجبور نہیں

کیا کہوں سلطنتِ حُسنِ بتاں کی خوبی — صرف دستور ہے پابندیٔ دستور نہیں

بے زبانی بھی محبت میں اثر رکھتی ہے — حسن سے شکوہ کروں مجھ کو یہ منظور نہیں

ایک میں ہوں کہ تری یاد ہی ہے کام مجھے — ایک تو ہے کہ مرا ذکر بھی منظور نہیں

جو بھی عاشق ہے وہ گردن زدنی ہے ساحلؔ

کچھ خصوصیتِ قیدِ سرِ منصور نہیں

مطبوعات جدیدہ

پرانے چراغ ۔ مرتبہ ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۶۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۔ عہ ۱۲ ؍ پتہ مکتبۂ فردوس لکھنؤ۔

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے بعض از افراد کی وفات کے بعد لکھے تھے، ان میں علماء، مصنفین، مدرسین، شعراء، ارباب سلوک قومی و ملی رہنما اور حکومت کے بعض اعلیٰ عہدیدار شامل ہیں، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا وصی اللہ فتحپوری، مولانا حیدر حسن خان ٹونکی، مولانا خلیل عرب، سید صدیق حسن آئی ۔ سی ۔ ایس، مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبد الجلیل ز اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی وغیرہ، فاضل مصنف کے ان سب سے مخلصانہ روابط تھے، انھوں نے ان کی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، اس لئے ان کے دلآویز قلم سے ہر ایک کی خدمات کے گوناگوں پہلو، زندگی کے مختلف نقوش اور شخصیت کے خط و خال پوری طرح نمایاں ہو گئے ہیں، اس مجموعہ کے ہر مقالہ سے لطف اندوز ہونا ناگزیر ہے، لیکن مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا احمد علی لاہوری سے متعلق مقالات کے مطالعہ میں کچھ اور ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے، مجموعہ کی ابتدا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے ذکر

ہوئی ہے، اس میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے ان کے تعلق کا خاص طور پر مفصل ذکر ہے ان تاثراتی مضامین میں خود مضمون نگار مصنف کے حسن مذاق، لطافت طبع، دینی و ملی حمیت، شوق و دلچسپی کی چیزوں، علمی اشتغال، جذبۂ خدمت و اخلاص، ذوق دعوت و تبلیغ اور دلسوزی و درد مندی کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں، یہ مجموعہ مختلف طبقوں کے ارباب کمال کے متعلق تاثرات و مشاہدات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ ہے، جو امید ہے کہ ہر طبقہ میں شوق سے پڑھا جائے گا۔

لغات القرآن ۔ مرتبہ ۔ جناب عبد الکریم پاریکھ صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۰۲ قیمت ۔ عہ ؍ پتے (۱) محمد عبد الرشید خان صاحب مین روڈ، کامٹی، ضلع ناگپور، (۲) عبد الکریم پاریکھ صاحب ٹمبر مرچنٹ، اتواری ناگپور (۸) (۳) حنیف بکڈپو، مومن پورہ ناگپور سٹی،

عربی میں قرآن مجید کے الفاظ و لغات پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اردو میں بھی بعض مفید کتابیں چھپی ہیں اس کتاب کے مصنف جناب عبد الکریم پاریکھ دین و ملت کی خدمت کا بڑا ولولہ رکھتے ہیں اور ان کو دعوت و تبلیغ کے کام سے خاص دلچسپی ہے، یہ کتاب ان کے اسی دینی و تبلیغی جذبہ کا مظہر ہے، اس میں ہر لفظ کو اس کی اسی شکل میں جس میں وہ قرآن مجید میں آیا ہے، نقل کر کے اس کے معنی دئے گئے ہیں، چنانچہ افعال کے مصادر کے بجائے ان کے مختلف صیغوں کے معنی لکھے ہیں، اور ضمیروں، اشارات بلکہ حروف و صلات تک کے معنی درج ہیں، ابتدا میں عربی کے نو اسباق بھی شامل ہیں، آسانی کے لئے پاروں، سورتوں اور رکوع کی تقسیم بھی کر دی گئی ہے، مصنف کے خیال میں اگر ایک ایک رکوع کے الفاظ حفظ کر لئے جائیں تو مشق کی کثرت سے قرآن کا ترجمہ کر لینا ممکن ہو جائے گا مگر راقم کی رائے میں طویل العمر اور مشغول لوگوں کے لئے یہ بات آسان نہیں ہے

اگر کوئی شخص اتنی ہی محنت و مشقت عربی زبان سیکھنے کے لیے کرے تو یہ زیادہ بہتر صورت ہوگی، مصنف نے یہ کتاب بڑے دینی ولولہ اور نیک جذبہ سے لکھی ہے، اس لئے بعض فروگذاشتوں کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے، انھوں نے عموماً فعل ماضی کے صیغے لکھکر مصدر کے معنی تحریر کئے ہیں، عربی کے تیسرے سبق کے صفحات ۲۳ و ۲۴ پر بھی یہی کیا ہے، کئی جگہ جو صیغے لکھے ہیں وہ قرآن میں مستعمل صیغوں سے مختلف ہیں، اس سے قاری کو بڑی الجھن پیش آئے گی مثلاً ص ۵۹ پر کتم (فعل ماضی) لکھکر مصدر کا ترجمہ کیا ہے حالانکہ قرآن میں تکتموا (مضارع مجزوم) استعمال ہوا ہے اس طرح کا سہو متعدد جگہ ہوا ہے، بعض لفظوں اور فقروں کے معنی میں بھی مسامحت ہوگئی ہے، مثلاً غی (ص ۱۰۵) کے معنی سرکشی، بغاوت اور نافرمانی صحیح نہیں ہیں بلکہ گمراہی صحیح ہے اسی طرح یسومون کا ترجمہ سخت تکلیف پہنچائی کے بجائے سخت تکلیف پہنچاتے تھے، تثیر الارض (ص ۶۹) کے معنی زمین جوتی ہوئی کے بجائے زمین کو جوتتی ہو اور یقولا (ص ۸۱) کا ترجمہ کہیا، ان دونوں نے کے بجائے، وہ دونوں کہہ دیتے تھے، مناسب ہوگا اسیطرح تسقی (۶۹) کا ترجمہ پانی دینے والی (بصیغہ فاعل) بھی خلاف احتیاط ہے، بعض الفاظ کے مشہور معنی ترک کرکے غیر معروف معنی لئے ہیں جیسے فوم ص ۶۶ کے معنی لہسن کے بجائے گیہوں اور باغ (ص ۹۱) کے معنی حجامت کرنے والے کے بجائے بے حکمی کرنے والا لکھا ہے، بعض جگہ جو الفاظ نقل کئے ہیں انکے معنی قرآن کے ماسبق و مابعد کی رعایت سے لکھے ہیں، مثلاً صرف مولود (ص ۱۰۰) لکھا ہے، اور معنی لڑکے والا دیا ہے، حالانکہ المولود لہ کے معنی ہیں، بعض جگہ جمع لفظوں کے معنی واحد اور واحد کے جمع تحریر کئے ہیں، جیسے امانی ص ۲، خطیئۃ ص ۳، اور ظلمات ص ۱۰۵ وغیرہ بعض الفاظ اور ان کے معنی سہواً چھوٹ گئے ہیں، جیسے لن نصبر (۶۵) اور یعلمان (ص ۸۲)

وغیرہ، امید ہے کہ ان فروگذاشتوں کو آئندہ اڈیشن میں درست کر دیا جائے گا، اس کتاب کے کئی اڈیشن نکلے ہیں انشاء اللہ مصنف کے خلوص نیت و برکت سے یہ اڈیشن بھی مقبول ہوگا۔

سات تحریریں — مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی، تقطیع متوسط کاغذ کتابت طباعت بہتر صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ پتہ۔ اردو پبلشرز ع۵ تلک مارگ لکھنؤ۔

یہ حسب ذیل سات مضامین کا مجموعہ ہے (۱) مولانا ابوالکلام آزاد کی خطنگاری (۲) احتشام صاحب کے دیباچے (۳) شاعر مشرق علامہ اقبال اور انکا سنہ ولادت (۴) حالی کے شخصی مرثیے (۵) حیات سید سلیمان کی چند جھلکیاں (۶) مہدی حسن افادی (۷) حسرت موہانی کی سیاسی زندگی، یہ سب مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، اور مختلف رسالوں میں چھپے تھے اب انکو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے، مضامین محنت و مطالعہ سے لکھے گئے ہیں، اور ادبی و تنقیدی حیثیت سے مفید ہیں خیالات بھی متوازن ہیں، مولانا حالی، علامہ سید سلیمان ندوی، مہدی افادی اور مولانا حسرت موہانی پر مضامین دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، اقبال کے سنہ ولادت کی مختلف روایتوں کو نقل کر کے اچھی بحث کی گئی ہے، مصنف نے جن مشاہیر علم و ادب کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کمالات کو موضوع بحث بنایا ہے انکی عظمت کے وہ معترف ہیں اسکے اظہار میں انھوں نے حسن ذوق اور سلیقہ سے کام لیا ہے، زبان اور انداز بیان بھی شگفتہ ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا۔

شمع فروزاں — از جناب عروج زیدی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت طباعت اچھی صفحات ۱۲۸ مجلد قیمت ۵ روپئے (۱) نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی (۲) مکتبہ حجاب رام پور (۳) عرفان زیدی، گھیر سیف الدین خان، رام پور،

جناب عروج زیدی پختہ مشق شاعر ہیں، انکا کلام اردو کے مشہور ماہناموں میں برابر چھپتا رہتا ہے، ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے مگر دوسرے اصناف سخن میں بھی جوہر طبع دکھا سکتے ہیں یہ عروج صاحب کے قطعات کا مجموعہ ہے، انکی طبیعت میں بلندی، اور خیالات میں پاکیزگی ہے، اسلئے کلام ابتذال سے خالی

اور درس آموز ہوتا ہے، وہ دور حاضر میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے باوجود انسانی قلوب کی بے نوری اور اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھکر سخت آزردہ ہیں اس لئے ان قطعات میں حسن اخلاص حسن عمل اور عظمت آدم کا پیام دیا ہے۔

اسرار نبوت، ہماری تعلیم کا مسئلہ ۔ مرتبہ۔ جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات بالترتیب، ۴۸ و ۲۶ قیمت بالترتیب ۵، ۴۰ پیسے، پتہ۔ فرقانیہ اکیڈمی ۱۶۴ پولیس روڈ، بنگلور ۲

مولوی شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور بڑے زود نویس ہیں موجودہ سائنسی امور و فلکیاتی مسائل تسخیر قمر وغیرہ پر بعض کتابیں اور مضامین لکھکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، یہ دونوں کتابچے ان ہی کے قلم سے ہیں پہلے میں نبوت کے مقاصد سائنسی نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں اس میں آفتاب فلکی (سورج) اور آفتاب رسالت (محمدؐ) کے خصوصیات بیان کر کے مختلف حیثیتوں سے انکی فیض رسانی وغیرہ کا ذکر ہے یہ کتابچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے لیکن کہیں کہیں بلاضرورت نامناسب طور پر انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسے ہمارے لئے سمندروں سے پانی بھی ٹرانسپورٹ کرتا ہے (ص ۴) اسلامی سانچے میں ڈھلنے کی پریکٹس کرانا (ص ۲۱) خوف و خشیت الہی کا ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے (ص ۲۵) اسکے لنگ لنگ سے امید و یقین کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں (ص ۳۰) تلاوت (ص ۳) کو مذکر لکھا ہے حکم کی جمع احکامات (ص ۲۳ و ۲۶) اور وجہ کی وجوہات (ص ۳۴) غلط ہے بہشتہ (ص ۱۳ و ۱۴) کا صحیح املا بہشتی ہے، شاہد کا ترجمہ نگراں (ص ۸) بروج کا کہکشاں (ص ۳) اور یحری کا دوڑ رہا ہے (ص ۷) محل نظر ہے، دوسرے کتابچہ میں مسلمانوں کے اس زمانہ کے اہم اور ضروری مسئلہ تعلیم کے متعلق یہ مناسب خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کیلئے تو بقدر ضرورت دینی مسائل کا جان لینا اور نئے علوم و مسائل سے کچھ نہ کچھ لگاؤ رکھنا کافی ہوگا مگر مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دینی و دنیوی علوم کی جامع اور ہر دو میں کمال رکھنے والی ہو، اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے بعض تجویزیں پیش کی ہیں، اس قسم کی تجویزیں پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں مگر اب قوم کے ارباب حل و عقد کو اس جانب عملی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے محض تجویزیں قلمبند کر دینے سے یہ پیچیدہ اور نازک مسئلہ حل ہو سکتا ہے نہ امت مسلمہ کی تعمیر ترقی ہو سکتی ہے۔

جلد ۱۲۱ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۷ء عدد ۲

مضامین